MASK-UP INDIA

آج کل

₹22/- جنوری 2021



آجکل کی فائل سے:

اردو تحقیق پر ایک نظر

گیان چند



اردو میں تحقیق کی بری بھلی داغ بیل تذکروں ہی میں نظر آتی ہے۔ میں مانتا ہوں کہ ان میں تحقیق سے زیادہ عدم تحقیق کا ثبوت دیا گیا ہے لیکن انہیں میں تحقیق کے لیے مواد ملتا ہے۔ تحقیق کے سفر کی دوسری منزل ادبی تاریخیں ہیں۔ ان میں کسی قدر ترقی ہوئی ہے لیکن یہاں بھی عدم احتیاط عام ہے۔ ان میں مختلف ذریعوں سے مواد لے کر چھان پھٹک کے بغیر جمع کر دیا گیا ہے۔ بعد کی تاریخیں شروع کی تاریخوں سے بہتر ہیں۔

سچ تو یہ ہے کہ اہل اردو کے لیے ادبی تحقیق کے کھرے اصول علم تدوین احادیث میں موجود تھے۔ محدثین نے روایت[1] اور درایت کو پرکھنے کے لیے جو اصول وضع کیے تھے، ادبی تحقیق کے سلسلے میں ان پر اضافہ نہیں ہوسکتا، لیکن ان کا معیار اتنا سخت تھا کہ اردو ادب کی تاریخ پر اس کا اطلاق کیا جائے تو پھر کسی ادبی روایت پر بھروسہ ہی نہیں کیا جاسکتا۔ بہرحال محققوں کو محدثین کے حزم واحتیاط کو مثالی نمونے کے طور پر ہمیشہ نظر میں رکھنا چاہئے۔

اردو میں جدید ادبی تحقیق مغربی تعلیم کا فیضان ہے۔ ابتدائی محققوں میں ہم مولوی عبدالحق، ڈاکٹر زورؔ، محمود شیرانی اور شیخ چاند کا نام لے سکتے ہیں۔ شیخ چاند کی کتاب 'سودا' اردو میں تحقیقی وتنقیدی مقالوں کی پیش رو تھی۔ ان کے بعد ہمارے پانچ چھ عظیم محققین کے کارنامے سامنے آئے۔ یونیورسٹیوں میں ریسرچ ہونے لگی۔ چنانچہ آزادی سے قبل مغربی اور ہندوستانی یونیورسٹیوں سے دس کے لگ بھگ علما اردو میں ڈاکٹریٹ لے چکے تھے۔

آزادی کے بعد درسگاہوں کے اندر اور باہر دونوں جگہ ادبی تحقیق کو بہت فروغ ہوا اور یہ تعلیم کے عام فروغ کا حصہ تھا۔ تقسیم کے بعد ہم ہندوستان کے تحقیقی کاموں کا جائزہ لے سکتے ہیں۔ پاکستانی نگارشات پہلے بھی دیکھنے کو کم ملتی تھیں۔ یحییٰ شاہی نے دونوں ملکوں کے علم وادب کے بیچ ایک لوہے کی دیوار کھڑی کر دی۔ ہم ہندوستان ہی کے اکتسابات کو نظر میں رکھیں تو بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہ بھرپور ہیں۔

تقسیم کے بعد ہمارے دیار میں اردو کی ابتدائی اور اعلیٰ تعلیم کا تناسب بالکل بدل گیا۔ آزادی[2] سے پہلے ابتدائی جماعتوں میں فرض کیجئے۔ اردو پڑھنے والوں کی سالانہ تعداد دو کروڑ اور ایم اے اردو کرنے والوں کی 100 تھی تو آزادی کے بعد ابتدائی جماعتوں میں اردو پڑھنے والے اگر پچاس لاکھ ہوں تو ایم اے کرنے والے تین سو ہوں گے۔ اردو میں صرف ایک کلاس ہے جس میں طلبہ ہمارے وسائل سے بڑھ کر میسر آتے ہیں اور وہ سب سے اونچی جماعت یعنی ریسرچ کی ہے۔ میں نہیں جانتا کہ اسے فالِ نیک کہوں یا فالِ بد۔ یہ جانتا ہوں کہ ان میں سے بیشتر امیدوار ذوق تحقیق کے مارے نہیں ہوتے، بے روزگاری کے ستائے ہوتے ہیں۔ (باقی 49 صفحہ پر)

---

[1] ملاحظہ ہو ڈاکٹر مصطفیٰ خان: ''فن تحقیق نقوش'' جنوری 1966 صفحہ 176

[2] میں نے یہ تعداد اپنی بات سمجھانے کے لیے لکھ دی ہے کسی اعداد وشمار کی بنا پر نہیں۔

آجکل کی فائل سے:

غیر مسلم مصنفینِ اردو کانفرنس

یہ تاریخی حقیقت ہے کہ اردو کسی مذہب یا کسی ایک خاص مذہب کے ماننے والوں کی زبان نہیں اور نہ ہندوستان کی اس چھٹی بڑی زبان کا ادب کسی ایک مخصوص فرقے کا ادب ہے۔ ہندوستانی تہذیب کی طرح اردو زبان اور اس کا ادب بھی مختلف، متنوع اور رنگارنگ عناصر کا حامل ہے۔ اس میں اسی دھرتی کی بو باس ہے۔ اس کی ایک اور خصوصیت بھی قابل توجہ ہے۔ وہ یہ کہ اردو زبان کسی ایک علاقے میں محدود نہیں۔ اس کے بولنے پڑھنے اور لکھنے والے سارے ملک میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ایک خاصی تعداد ایسے افراد کی ہے جن کی مادری زبان ہندوستان کی کوئی دوسری قومی زبان ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ مختلف فرقوں کے مختلف عقائد رکھنے والوں نے اس زبان میں اپنے نظریات وعقائد پیش کیے۔ لیکن جب بھی پورے ملک کا معاملہ درپیش آیا تو سارے دل ایک ساتھ دھڑکے ہیں۔ گویا اردو زبان سب فرقوں کی زبان اور اردو ادب سارے ملک کا مشترک ادب ہے۔

تاہم صورت حال کے برعکس بعض مفاد پرستوں نے گزشتہ کچھ عرصے سے اس زبان کو عوام کے ایک خاص فرقے یعنی مسلمانوں کی اور پاکستان کی زبان کہنا شروع کر دیا تھا۔ ان کے نزدیک یہ ایک غیر ملکی زبان ہے۔ جو ہمارے ملک ومعاشرے میں کسی قسم کی مراعات اور حقوق کا استحقاق نہیں رکھتی۔ وہ اس بات کو لائقِ اعتنا نہیں سمجھتے کہ پاکستان میں اردو مادری وثانوی زبان والوں کی تعداد ہمارے ملک کی اردو آبادی کا کوئی آٹھواں حصہ ہے۔

مفاد پرستوں کے ذہنوں میں پرورش پانے نیز ان کی جانب سے پھیلائی جانے والی غلط فہمیوں کو ختم کرنا ضروری تھا۔ اتنا ہی ضروری اردو کے واسطے واجب مراعات وحقوق کی مانگ کے لئے کوئی ٹھوس اقدام کرنا تھا۔ ایسا اقدام غیر مسلموں کی جانب سے اور بھی مستحسن اور مشکور تھا۔

اسی امر کے پیش نظر اردو کے افسانہ نگار رام لال نے اردو کے ادیبوں ڈاکٹر امرت لال عشرت، بشیشر پردیپ، کلدیپ تلواڑ اور ڈاکٹر نریش کے اشتراک سے لکھنؤ میں اردو زبان کے غیر مسلم ادیبوں اور ہمدردوں کے ایک کل ہند اجتماع کا اہتمام کیا جو دس اور گیارہ نومبر 1973 کو منعقد ہوا۔

یہ کانفرنس تاریخی نوعیت کی حامل ہے۔ اس میں سارے ملک کے مختلف حصوں اور علاقوں سے اردو کے ڈیڑھ سو غیر مسلم افسانہ نگار، شاعر، نقاد اور محققین اور 40 مشاہدین نے شرکت کی۔ اس کانفرنس میں بحیثیت مندوب شریک ہونے والوں میں بمبئی سے کرشن چندر، شام کشن نگم، جموں سے ڈاکٹر گیان چند، دہلی سے پنڈت آنند نرائن ملّا، عرش ملسیانی، بلراج کومل، کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، دی شنکر، ساحر ہوشیار پوری، کرشن موہن، کرشن مراری، ستیش بترا، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، امرتسر سے شرون کمار ورما، پورن سنگھ ہنر، جالندھر سے پنڈت میلا رام وفا، شملہ سے کرشن کمار طور، (باقی 52 صفحہ پر)

اردو کا بین الاقوامی ادبی اور ثقافتی ماہنامہ

آجکل

نئی دہلی

جلد:79 شمارہ:06

جنوری2021 پوش۔ماگھ شک1942

ایڈیٹر

حسن ضیاء

فون:011-24369189

معاون : نرگس سلطانہ

کمپوزنگ : آئی احمد

سرورق : توقیر حبیب

پروڈکشن آفیسر: وی رامالنگم

آجکل کے مشمولات سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں

فی شمارہ:22روپے

رجسٹرڈ ڈاک سے سالانہ:434روپے

دوسال:838روپے تین سال:1222روپے

خریداری واشتہار کے لیے منی آرڈر، ڈرافٹ اور پوسٹل آرڈر

DG, Publications Division کے نام اس پتہ پر بھیجیں:

Incharge, Business Wing

Publications Division

7th Floor, Soochna Bhawan, CGO Complex,

Lodhi Road, New Delhi-110003

فون نمبر:011-24365609 24367453

رسالے کی عدم دستیابی سے متعلق شکایتیں بزنس منیجر کو مندرجہ ذیل آئی ڈی پر میل کریں

pdjucir@gmail.com

مضامین/تخلیقات سے متعلق رابطے کا پتہ:

Editor Ajkal (Urdu)

Publications Division 601-A Soochna Bhawan

CGO Complex, Lodhi Road, New Delhi-110003

e-mail: ajkalurdu@gmail.com

website: www.publicationsdivision.nic.in

نیا سال مبارک

ترتیب

اداریہ : آزادی اور جمہوریت کا سفر حسن ضیاء 4

مضامین :

داراشکوہ اور احترامِ ادیان ڈاکٹر شیخ عقیل احمد 5

آزادی کے بعد اردو افسانے میں تحریک آزادی کی گونج ڈاکٹر عابد حسین حیدری 8

دوار کا داس شعلہ: تلمیذ یگانہ ڈاکٹر تمثیل احمد 12

روایت در روایت کا شاعر: شعری بھوپالی مقبول واجد 14

شانتی رنجن بھٹاچاریہ کی ادبی وعلمی خدمات محمد نوشاد عالم ندوی 17

علی گڑھ میگزین، اکبر نمبر اور شبیہ الحسن نونہروی سید سبط حسن نقوی 19

اردو صحافت:

اعزاز افضل کے صحافتی قطعات ڈاکٹر ارشاد شفق 23

افسانے:

پالی بھیشم ساہنی/شمیم فاروقی 26

پگلی شیریں نیازی 31

آگاہی افشاں احمد 34

زمین کے فرشتے مستجاب شیلی 35

منظومات:

کرشن کمار طور، ڈاکٹر رؤف خیر، ماجد علی کاوش 38

وہاج الحق کاشف، اشفاق نجمی، ڈاکٹر مقصود عالم رفعت 39

عاتکہ ماہین، نیلوفر پروین، برجیس آرزو 40

تبصرے **مبصر** **41**

یادیں اور باتیں/ڈاکٹر نعیمہ جعفری پاشا عذرا نقوی

یک موضوعی مجلّہ: انداز بیاں/مدیر: حقانی القاسمی محمد شارب ضیاء رحمانی

نیا حمام/ذاکر فیضی رضی شہاب

شعور کی رو/سلطان آزاد جمال عباس فہمی

جامعہ کشمیر کی اردو ادبی خدمات/ڈاکٹر محمد یاسین گنائی شاد سجاد

ماہنامہ طبی ڈائجسٹ 'الشفاء'/مدیر: سید اعجاز حسین نرگس سلطانہ

روبرو:

ماہر شبلیات ڈاکٹر الیاس الاعظمی سے ایک ملاقات عمران عاکف 45

مراسلات **54**

آزادی اور جمہوریت کا سفر

26 جنوری 2021 کو ہندوستان اپنا 72واں یوم جمہوریہ منا رہا ہے۔آبادی کے اعتبار سے یہ دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت ہے۔یہ دن ہمیں جوش وخروش کے ساتھ جمہوریت کا جشن منانے کے ساتھ ساتھ جمہوریت کی اب تک کی کارکردگی کا جائزہ لینے اور مستقبل کے امکانات پر غور کرنے اور اپنی خوبیوں اور خامیوں پر ایک نظر ڈالنے کا موقع بھی فراہم کرتا ہے۔اگلے برس یعنی 2022 میں آزادی کے 75 سال بھی مکمل ہو رہے ہیں۔

اٹھارہویں صدی میں امریکی تحریک آزادی کے علمبردار بینجمین فرینکلن نے ذہین انسانی معاشرے کے لیے آزادی کو شرط اولیں قرار دیا تھا اور مہذب سماج پر یہ فرض عائد کیا تھا کہ وہ ہر فرد کو پرامن زندگی جینے دے۔مشرق سے مغرب تک، یوروپ سے ہندوستان تک، آزادی اور مساوات کے تصورات کی پوری تاریخ ہے جس نے مختلف خطّوں میں آزادی کی تحریکوں کو فکری اساس فراہم کی ہے۔لیکن آج سب سے بڑا مسئلہ دنیا بھر میں اس آزادی کو برقرار رکھنے اور اختیارات کے ناجائز استعمال کو روکنے کا ہے۔

آزادی سے مراد بغیر کسی پابندی کے کوئی کام انجام دینے یا موجودہ صورتحال کو تبدیل کرنے سے ہے۔جب انسان نے سماج بنا کر رہنا شروع کیا تو ظاہر ہے کہ اس کی آزادی بھی سماج کے مجموعی مفادات کے تابع ہوگئی۔یوروپ کے مشہور مفکر رُوسو کو سماج سے تو شکایتیں تھیں لیکن وہ انفرادی طور پر انسان کو اچھا اور خوبیوں کا مالک مانتا ہے۔اس بات کا انحصار با اختیار انسانوں پر ہے کہ وہ دوسرے انسانوں کی آزادی سلب کرنے کی کوشش نہ کریں۔تھامس ہوبس نے امن وانتظام اور سماجی حفاظت کو آزادی سے زیادہ اہم تصور قرار دیا تھا۔لاک کا کہنا تھا کہ انسان کو مکمل آزادی نہیں دی جاسکتی اور اسے قانون کا پابند کرنا ہوگا۔

ہندوستان کے آئین نے، جس کے اطلاق کا جشن ہم جشن جمہوریت کے نام سے مناتے ہیں دنیا کے سامنے قانون سازی کی ایک نئی مثال پیش کی۔ ہندوستان کی آئینی تاریخ کے ارتقا کی داستان بڑی دلچسپ ہے۔اس آئین نے ہندوستان کے ماضی کی روایات اور تہذیب کو پیش نظر رکھتے ہوئے دنیا کے بہترین فکری دھاروں اور قانون اور انصاف کے عالمگیر اصولوں سے بھی استفادہ کیا۔ ہمارے آئین کے سلسلے میں یہ بھی بات قابل غور ہے کہ یہ آئین کسی سیاسی انقلاب کے نتیجے میں وجود میں نہیں آیا بلکہ ہماری تحریک آزادی کے دور کے بہترین سیاسی اور قانونی ذہنوں کے غور وفکر کا نتیجہ ہے۔اس آئین کی تیاری کے بعد اسے آئین ساز اسمبلی میں منظوری سے پہلے عوام کے سامنے بھی رکھا گیا تھا اور عوام بھی اس پر اپنی رائے دینے اور ترامیم کی تجویزیں پیش کرنے کے لیے آزاد تھے۔

ہماری آئین ساز اسمبلی کا پہلا اجلاس 9 دسمبر 1946 کو کانسٹی ٹیوشن ہال میں ہوا تھا جسے اب پارلیمنٹ کے سینٹرل ہال کے طور پر جانا جاتا ہے۔اس کا پہلا اجلاس صبح گیارہ بجے، کارگزار صدر نشیں ڈاکٹر سچیدانند سنہا کے تعارفی کلمات سے شروع ہوا تھا۔29 اگست 1947 میں ڈاکٹر بی آر امبیڈکر کی قیادت میں ڈرافٹنگ کمیٹی تشکیل دی گئی جسے آئین کی عبارت لکھنی تھی، اس اسمبلی کو آئین کے مسودے میں 7635 ترامیم کی تجاویز موصول ہوئی تھیں جن میں سے 2473 پر غور کیا گیا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ دستاویز وسیع تر غور وفکر اور تمام پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد ہی وجود میں آئی تھی۔

یہ خیال کہ ہندوستان کے لوگ اپنا آئین اپنے لیے خود بنائیں اور یہ کام اپنے منتخب نمائندوں کے ذریعہ کریں، یہ بہت پہلے ہی ہندوستان کی تحریک آزادی کے رہنماؤں نے پیش کر دیا تھا لیکن پہلی عالمی جنگ کے خاتمے کے بعد برطانیہ نے حق خودارادیت کی اس تجویز کو مسترد کر دیا تھا لیکن بالآخر کابینہ مشن پلان 1946 کے تحت برطانوی سامراج نے اس بات کو تسلیم کرلیا کہ ہندوستان کا آئین بنانے کا حق ہندوستان کے عوام کو ہی ہے۔ہماری آئین ساز اسمبلی کی ایک خوبی یہ بھی رہی کہ اس نے اُن ماہرین سے بھی رجوع کیا جو ہر چند کہ اس اسمبلی کے رکن نہیں تھے لیکن ان کی رائے اپنے اپنے میدانوں میں بڑی اہمیت کی حامل تھی۔

قانون سازی کے تکنیکی پہلوؤں کے ساتھ قانون سازی کے لیے مستقبل شناسی اور آنے والے وقت کی ممکنہ ضرورتوں کا شعور بھی بہت اہم ہوتا ہے۔ہمارے آئین سازوں نے اپنی بہترین صلاحیتوں اور دوسروں کی آرا کو بھی بروئے کار لانے کے ساتھ ساتھ سب سے اہم بات یہ بھی پیش نظر رکھی کہ آنے والی نسلوں کو اپنی ضروریات کے پیش نظر آئین میں ترمیم کی گنجائش بھی رکھ دی کیونکہ تحریک آزدی میں شامل بعض دور اندیش رہنماؤں کا خیال تھا کہ عقل ودانش اور فہم وفراست کسی ایک نسل کی جاگیر نہیں ہے اور آئندہ نسلوں کو بھی اپنی فہم وفراست کو استعمال کرنے کا حق دیا جائے۔البتہ ہندوستان کے قانونی نظام نے یہ شرط بھی عائد کردی کہ پارلیمنٹ آئین میں تبدیلی کے بے پناہ اختیارات کا حامل ہونے کے باوجود آئین کے بنیادی ڈھانچے اور عوامی جمہوری کردار کو تبدیل نہیں کرسکتا۔

ایک طرف آج کا انسانی معاشرہ تعلیمی اور تہذیبی اعتبار سے زیادہ ترقی یافتہ تصور کیا جارہا ہے تو دوسری جانب آزادی، جمہوریت اور مساوات کے تصورات کو دنیا بھر میں نت نئے چیلنجوں کا مقابلہ ہے۔ان آدرشوں کا فروغ اور حفاظت ہی ہمارا فرض ہونا چاہئے۔

حسن ضیاء

ڈاکٹر شیخ عقیل احمد





داراشکوہ اور احترامِ ادیان

دارا شکوہ کو تاریخ میں بھولا بسرا مغل شہزادہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ وہ ایک ایسی شخصیت کا نام ہے جسے بدقسمتی سے ہندوستان کی حکمرانی تو نصیب نہیں ہوئی مگر آج بھی وہ شخص اپنے کشادہ ذہن اور وژن کی وجہ سے کروڑوں دلوں اور ذہنوں پر راج کر رہا ہے۔ اگر وہ خوش قسمتی سے ہندوستان کا حکمراں ہوتا تو اس ملک کی تاریخ، تصویر اور تقدیر بالکل بدلی ہوئی ہوتی کیونکہ داراشکوہ ایک ایسا فرد تھا جو صحیح معنوں میں مذہبی رواداری، سماجی ہم آہنگی، اتحاد پسندی، باہمی محبت و یگانگت، تنوع میں وحدت، (Unity in diversity) اور مخلوط معاشرت وثقافت کا قائل تھا، جو یہ جانتا تھا کہ 'گلہائے رنگارنگ سے ہے زینتِ چمن' اور جسے یہ بھی پتہ تھا کہ اس ملک کی خوبصورتی، اس کے تنوع (Diversity) میں ہے۔

یہ وہ شخص تھا جو ہندوستان کے امتزاجی معاشرے کا علمبردار اور سچ پوچھیے تو ہندوستانیت کی ایک روشن علامت تھا جسے آج ہندوستانیت کا مظہر کہا جاسکتا ہے۔ مشترکہ تہذیب کی ایک سچی مثال جس نے طبقات اور مختلف خانوں میں بٹے ہوئے پورے ہندوستانی معاشرے کو ایک لڑی میں پرونے کی کوشش کی۔ جو نہ صرف تمام ادیان کا احترام اور تمام دھرموں کا سمان کرتا تھا بلکہ اس کا تصور یہ تھا کہ دنیا کے تمام مذاہب یکساں ہیں، راستے الگ الگ سہی مگر منزل ایک ہے۔ ہر مذہب میں سچائی اور صداقت موجود ہے۔ ہر مذہب ایک روشنی کی مانند ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس نے ہندومت اور اسلام کے درمیان نقطۂ اشتراک کو تلاش کیا اور یہ ثابت کیا کہ ہندومت اور اسلام میں بہت سی چیزیں ایک جیسی ہیں۔ دونوں کے عقائد اور اخلاقیات میں بہت سی چیزیں مشترک ہیں، خاص طور پر دونوں کا نظریۂ توحید ایک ہے، سزا اور جزا کا تصور ایک ہے اور بھی بہت سی باتیں ہیں جو دونوں میں مشترک ہیں۔

ایسے تصورات کا حامل کوئی معمولی شخص نہیں تھا، بلکہ مغل شہنشاہ شاہجہاں کا سب سے بڑا بیٹا داراشکوہ تھا جسے شہنشاہی سے زیادہ فقیری اور درویشی، تصوف اور بھکتی سے دلچسپی تھی۔ جو سلسلہ قادریہ سے جڑا ہوا تھا اور ان صوفیاء کرام سے اس کا گہرا رشتہ تھا جن کی زندگی کا شعار محبت انسانی، احترامِ انسانیت اور خدمت خلق ہے۔ جہاں یہ تصور عام ہے کہ تمام مخلوق اللہ کا کنبہ ہے۔

داراشکوہ کا ذہنی سلسلہ ان اولیائے عظام اور صوفیاء کرام سے جڑا ہوا تھا جن کے دروازے بلا تفریق مذہب وملت ہر عام وخاص کے لیے کھلے رہتے تھے، جہاں عقیدے اور مذہب کی کوئی قید نہیں تھی، جن کے نزدیک انسانیت ہی سب سے بڑا مذہب تھا۔ ان کے پاس حسن سلوک، عدل و انصاف کا ایک جامع تصور تھا۔ ان کے نزدیک آدمی کا اتنا احترام تھا کہ وہ قرآن کی اس آیت کو اچھی طرح سمجھتے تھے کہ جس نے کسی ایک شخص کا قتل کیا گویا اس نے پوری انسانیت کا قتل کیا۔ اسی لیے انھوں نے تشدد اور تعصب کی بات کبھی نہیں کی بلکہ ہمیشہ انسانیت کی بات کی۔

ان صوفی سنتوں کا خیال یہ بھی تھا کہ جب ایک ہی چراغ سے کعبہ وبت خانہ روشن ہیں تو پھر کفر اور دین کی تفریق کیوں؟ اور یہی خیال داراشکوہ کے ذہن میں بھی نقش تھا، اسی لیے انھوں نے ایک بار شاہ حُب اللہ الہ آبادی جیسے صوفی سے یہ پوچھا تھا کہ کیا ہندو اور مسلمان میں فرق کیا جاسکتا ہے؟ تو شاہ محبّ اللہ الہ آبادی نے جواب دیا: یہ بالکل جائز نہیں ہے۔ صوفی سنتوں کا وطیرہ ہمیشہ اتحاد و یگانگت کا رہا ہے۔ انھوں نے ہر اس فکر اور فلسفے کو قبول کیا جس میں انسانیت کی فلاح اور صلاح تھی، چنانچہ ایک بڑے صوفی حضرت شیخ محمد غوث گوالیاری نے 'بَحرُ الحَیَات' کے نام سے سنسکرت کے 'اَمرِتُ کُنڈ' کا ترجمہ کیا اور یوگا کے فوائد بتائے۔ یہ وہ لوگ تھے جو ویدانت اور یوگ سے اچھی طرح واقف تھے۔

صوفیوں میں ایسے افراد کی بھی تعداد بہت ہے جو ہندو فلسفے سے اچھی طرح آگاہ تھے۔ خود محبوب الٰہی حضرت نظام الدین اولیاء کی خانقاہ میں جوگی اور برہمن آتے جاتے رہتے تھے اور ان سے فیض حاصل کرتے تھے۔ حضرت نے بھی اسی لیے کہا تھا کہ ہر قوم کا الگ قبلہ اور دین ہوتا ہے اور وہ کسی کو بھی غیریت کی نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔ صوفیوں میں ایسے لوگ بھی رہے ہیں جنھوں نے ہندو یوگیوں سے اچھی باتیں سیکھیں اور یہ بتایا کہ تصوف اور ویدانت دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ رام رحیم دونوں ایک ہیں۔ ان لوگوں نے عشق کی تعلیم دی اور یہی عشق ان کی زندگی کا منشور تھا۔

داراشکوہ پر انہی صوفیوں اور سنتوں کا بہت گہرا اثر رہا، اس لیے داراشکوہ نے مشترکہ عقائد پر گفتگو کی۔ ہندومت اور اسلام کے مشترک تصورات پر بات کی اور بین المذاہب مکالمے (Interfaith dialogue) کی ایک بہتر صورت نکالی۔ اس کی وجہ سے داراشکوہ معتوب بھی ہوئے۔ ان کو دائرۂ اسلام سے خارج بھی کیا گیا اور مرتد ہونے کے الزام میں ان کا قتل بھی ہوا مگر بنیادی طور پر داراشکوہ صلح کل کے آدمی تھے۔ وہ سنت کبیر اور مولانا رومی کے افکار سے بہت متاثر تھے۔ اسی لیے انھوں نے مذاہب کے تقابلی مطالعے پر مبنی ایک کتاب 'مَجمَعُ البَحرَین' (دو سمندروں کا سنگم) تصنیف کی اور ایک مشترکہ علمی اور روحانی وراثت کو تلاش کر کے اس نتیجے پر پہنچے کہ تمام مذاہب میں حق کا راستہ ایک ہی ہے اور اسی کتاب میں انھوں نے ویدانت اور تصوف کے مشترکہ عناصر پر بھی جامع اور مبسوط گفتگو کی۔ اسی کتاب کی وجہ سے انھیں ملحد قرار دیا گیا۔ جبکہ اس کتاب میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جو قابل اعتراض ہو۔ ممتاز ناقد و محقق پروفیسر تنویر احمد علوی نے لکھا ہے کہ ''سفینۃ الاولیا'، 'مجمع البحرین'، 'سرّ اکبر' اور رسالہ 'حق نما' کے مطالعے سے کہیں یہ پتہ نہیں چلتا کہ شہزادے کے عقیدے اسلام کی حقیقت اور اس کے مذہب کے برحق ہونے کے معاملے میں بدل گئے تھے۔ وہ اپنی کتاب 'مجمع البحرین' میں اسلام اور ہندوؤں کے فلسفیانہ افکار کے مابین یکجہتی اور ہم آہنگی کے رشتے اگر تلاش کرتا ہے تو اس میں کوئی ایمانی غلطی نہیں کرتا۔ اسلام سے منحرف ہونے کا اس میں کوئی شائبہ نہیں۔'' (بحوالہ محمود علی، داراشکوہ، سلیم پور، دہلی، مارچ 1999)

تصوف سے داراشکوہ کے گہرے رشتے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ داراشکوہ کی پیدائش خواجہ معین الدین چشتی کے شہر اجمیر میں ہوئی تھی اور یہ خواجہ صاحب کی دعا کی برکت اور قبولیت تھی کہ داراشکوہ کا جنم ہوا۔ مغل شہنشاہ شاہجہاں نے خواجہ صاحب کے دربار میں بیٹے کے تولّد کی دعا مانگی تھی۔ شاہجہاں اس وقت تین بیٹیوں کا باپ تھا۔ بادشاہ کو ایک بیٹے کی چاہت تھی۔ اللہ تعالیٰ نے

کاٹیج 42، شپرا سوسائٹی، اندرا پورم، غازی آباد۔ 201014
فون: 09911796525 aquilahmad2@gmail.com

ان کی دعا قبول کی اور داراشکوہ پیدا ہوئے۔ مشہور شاعر ابوطالب کلیم نے اپنے قصیدے میں اسے 'گل اوّلیں گلستانِ شاہی' لکھا۔

سرزمین اجمیر کی روشنی اور خوشبو کا اثر 'گلستانِ شاہی کے گل اولیں' داراشکوہ کی سرشت پر پڑا اور اسی وجہ سے ان کا فطری اور طبعی رجحان تصوف کی طرف رہا اور تصوف کی بنیادی تعلیمات اور افکار نے ان کے ذہن وفکر کو متاثر کیا۔

داراشکوہ نے جہاں تصوف کے حوالے سے بہت سی کتابوں کا مطالعہ کیا وہیں شاہ محبّ اللہ الہ آبادی، ملا شاہ بدخشی، میاں جیو اور مجذوب سرمد سے بھی ان کا بہت گہرا تعلق رہا۔ اس کے علاوہ داراشکوہ نے یوگیوں میں بابا لال یوگی، پنڈت جگن ناتھ اور ویدانت کے دیگر ماہرین سے اپنا تعلق رکھا اور ان سے مسلسل رشتے کے نتیجے میں ان کے ذہن وفکر کے دروازے کھلتے گئے۔ ہندو یوگیوں سے ان کا گہرا رشتہ تھا۔ انھوں نے شنکر آچاریہ، رامانُج اور کبیر کی بھکتی سے بہت اثر قبول کیا تھا۔ اسی وجہ سے انھوں نے نہ صرف سنسکرت زبان سیکھی بلکہ باضابطہ سنسکرت ادب کا مطالعہ کیا اور ہندومت کی کتابوں کے ترجمے فارسی میں کیے تاکہ ہندو فلسفے کو اچھی طرح سمجھ سکیں اور دونوں مذاہب کے مابین جو غلط فہمیاں اور شکوک وشبہات ہیں ان کا اِزالہ ہو سکے۔

مسلمان صوفیاء اور یوگیوں سے تصوف اور ویدانت کے مسائل پر داراشکوہ کی بڑی اہم گفتگو ہوا کرتی تھی۔ ان سوالات اور جوابات نے ان کو اسلام، ویدانت اور بھکتی کے بارے میں پوری معلومات مہیا کر دی اور ان کے ذہن کو بھی صاف کیا اور انھیں اس بات کا احساس دلایا کہ فقیر بن کر انسان کی خدمت کرنا حکومت کرنے سے زیادہ بہتر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ داراشکوہ نے سلطنت کے بجائے درویشی کو ترجیح دی۔

ہندوستانی فکر وفلسفہ، تہذیب وثقافت پر داراشکوہ کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ اس نے ان اپنشدوں کو بیرونی دنیا میں متعارف کرایا جس میں حکمت ودانش کا بیش بہا خزانہ تھا۔ وہی پہلا شخص تھا جس نے 52 اپنشدوں کا فارسی میں ترجمہ کیا اور ہندومت اور اسلامی تصوف کے درمیان ایک مشترکہ بنیاد کی تلاش کی، انہی کے ترجموں کے بعد اُپنشد کا ترجمہ فرانس، جرمنی اور دوسرے مغربی ممالک میں ہوا۔ مشہور فرانسیسی سیّاح برنیئر اس ترجمے کو فرانس لے کر گئے۔ فرانس کے حلقے میں اس کی بڑی پذیرائی ہوئی اور ہندوستانی فلسفے کے تئیں ایک عقیدت اور محبت کا سیلاب امنڈ پڑا۔ ایک مشہور فرانسیسی فلسفی Victor Cousin نے ویدانت کی تعریف کرتے ہوئے کہا تھا کہ یہ انسانی کائنات کا ایک عظیم فلسفہ ہے۔ Friedrich Von Schelling، Arthur Schopenhauer، Paul Deussen، بھی اُپنشد سے بہت متاثر ہوئے اور میکس مولر کو مجبور کیا کہ وہ اس کا نہ صرف ترجمہ کریں بلکہ جرمن میں اس کی تشہیر وتبلیغ کریں۔

شوپنہاور جیسا دانشور 'اپنشد' کا بہت بڑا مداح تھا۔ کلکتہ میں ایشیاٹک سوسائٹی کے بانی سر ولیم جونس نے بھی اُپنشد کی بہت تعریف کی اور کہا کہ یہ ایک عظیم صحیفہ ہے۔ مغربی دنیا میں اپنشدوں کو متعارف کرانے کا سہرا داراشکوہ کے سر جاتا ہے۔ اگر داراشکوہ نے اس میں دلچسپی نہ لی ہوتی تو شاید اپنشد کا حلقۂ اثر اتنا وسیع نہ ہوتا۔ اس لیے ہمیں داراشکوہ کا ممنون ہونا چاہیے کہ اس نے اپنشد کے فلسفے کی تبلیغ وتشہیر کی اور ویدانت اور اسلامی تصوف کے درمیان ایک نقطۂ اتحاد تلاش کیا اور صرف یہی نہیں کہ انھوں نے اسلام اور ہندومت کی مشترکہ روایت اور وراثت پر زور دیا بلکہ یہ بھی بتایا کہ قرآن کریم کی آیت انہ لقرآن کریمO فی کتاب مکنونO لا یمسہ الا المطھرونO تنزیل من رب العلمینO میں جس کتاب مکنون کا ذکر ہے وہ دراصل 'اپنشد' ہی ہیں۔ چنانچہ انھوں نے سِرِّ اکبر کے عنوان سے اُپنشد کا فارسی میں ترجمہ کیا۔

اس کے مقدمہ میں داراشکوہ نے لکھا ہے کہ:

''میں نے ہندو علوم کے مرکز یعنی بنارس میں رہنے والے پنڈتوں اور سنیاسیوں کو جمع کیا اور ان کی مدد سے 6 ماہ کے عرصے میں دہلی میں اپنشدوں کا ترجمہ مکمل کیا۔''

(داراشکوہ: سکینۃ الاولیاء، اردو ترجمہ: پروفیسر مقبول بیگ بدخشانی، ناز پبلشنگ ہاؤس، پہاڑی بھوجلہ، دہلی 6)

داراشکوہ نے صوفی سنتوں، سنیاسیوں، یوگیوں، پنڈتوں اور عالموں سے سوال و جواب کر کے بہت ساری معلومات حاصل کیں اور تحقیق وجستجو کے بعد یہ نتیجہ نکالا کہ اسلام اور ہندومت میں صرف الفاظ اور مفاہیم کا فرق ہے باقی دونوں مذاہب کی ماہیت اور روح ایک ہے اور یہ بھی بتایا کہ دونوں مذاہب میں صلح آشتی اور امن کی تعلیم دی گئی ہے اور یہ بھی کہ دو متضاد چیزیں روحانی سطح پر ایک ہو سکتی ہیں۔ 'مَجمعُ البحرین' میں انھوں نے پانچ بھوت، پنچ اِندری، دُھن، آتما پر ماتما، ترگُن، تری مورتی، اُوم، نرنجن، برہما نند جیسے ہندو فلسفوں اور نظریوں کو بیان کیا اور اسلامی تصوف کے ذریعے ان کے اشتراک کی جستجو کی۔ اس طرح انھوں نے دونوں مذاہب کے بنیادی تصورات میں مماثلت کو بیان کیا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ مسلمان جس طرح ذاتِ مطلق علیم، قادر، بصیر وغیرہ کہتے ہیں اسی طرح ہندو، ترگُن، نرنکار، نرنجن، ستیہ وغیرہ کہتے ہیں۔ مسلمان جنھیں 'مظہر' کہتے ہیں ہندو انھیں 'اوتار' کہتے ہیں۔ مسلمانوں کے نزدیک جو 'وحی' ہے ہندوؤں کے یہاں وہ 'آکاش وانی' ہے۔ مسلمان جنھیں 'کتب آسمانی' کہتے ہیں ہندو انھیں 'وید' کہتے ہیں۔ ان کے بقول مہادیو اسرافیل ہیں اور وِشنو میکائیل ہیں۔ اسی طرح مسلمانوں کے یہاں 'قیامت' کا تصور ہے تو ہندوؤں کے یہاں 'پُرلے' کا۔ اس کتاب کے تعلق سے پروفیسر مقبول بیگ بدخشانی لکھتے ہیں کہ:

''یہ کتاب لکھتے ہوئے داراشکوہ کے پیش نظر ہندوؤں اور مسلمانوں کے ویدانتی اور صوفیانہ عقائد تھے'' جیسا کہ وہ مقدمہ میں لکھتا ہے:

> ''ہندوؤں سے میل جول اور بحث وتمحیص سے اسے معلوم ہوا کہ معرفت ربانی کے سلسلے میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں جو اختلاف ہے وہ محض زبان وبیان کا ہے۔ مقدمہ میں اس نے کفر واسلام اور دیر وحرم کی یگانگت اس طرح بیان کی ہے: تعریف اس خدائے یگانہ کی ہے جس نے اسلام اور کفر کی دو زلفیں جو ایک دوسرے کے مقابل میں اپنے چہرے پر لہرائیں۔ ان میں سے کوئی ایک بھی اس کے رخ نیکو کے لیے موجب حجاب نہیں۔''

(داراشکوہ: سکینۃ الاولیاء اردو ترجمہ پروفیسر مقبول بیگ بدخشانی)

داراشکوہ بنیادی طور پر اپنشد کے فلسفے سے بہت متاثر تھے اسی لیے انھوں نے اپنشد کا ترجمہ ہی نہیں بلکہ انھوں نے اپنشد کے افکار کی تشریح بھی کی اور اس سلسلے میں بہت سے اہم مفسرین اور مفکرین سے مدد بھی لی ہے۔

داراشکوہ نے اسلامی تصوف کی تعلیم حضرت میاں میر سے حاصل کی جنھوں نے اپنے دست مبارک سے سکھوں کے مقدس دربار کا سنگ بنیاد رکھا تھا جسے آج 'گولڈن ٹیمپل' کہا جاتا ہے۔ ان کے علاوہ وہ ملا شاہ بدخشی کے مرید تھے۔ اسی طرح ہندو جوگیوں میں انھوں نے سنت کبیر کے پیروکار **لالہ داس** سے ویدانت کا فلسفہ سیکھا۔ ان کا ایک مکالمہ بابا لال بیراگی سے بہت مشہور ہے۔ بیراگی سے ان کی بہت طویل ملاقاتیں رہی ہیں اور ان دونوں کے درمیان جو سوال و جواب ہوئے ہیں، اس میں اسلامی تصوف اور ویدانت کے حوالے سے بڑی قیمتی گفتگو ہے۔ اس طرح داراشکوہ نے ہندومت اور اسلام کے درمیان ایک مضبوط رشتے اور قربت کو تلاش کیا اور اس تنگ نظری کا خاتمہ کرنے کی کوشش کی جو مذہبی بنیاد پر روا رکھی گئی تھی۔

صوفیا سے انھیں اتنی عقیدت تھی کہ انھوں نے 'سَفِیْنَۃُ الْاَوْلِیَا' کے نام سے 25 سال کی عمر میں کتاب لکھی جو 1639 میں مکمل ہوئی جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، خلفائے راشدین، ازواجِ مطہرات، ائمہ اربعہ کے علاوہ 411 صوفیائے کرام کا تذکرہ ہے۔ انھوں نے صوفی سلسلے سے متعلق بہت سی معلومات اس میں پیش کی ہیں۔

داراشکوہ بطور تمہید لکھتے ہیں کہ:

''مخلوقات الٰہی میں انبیاء علیہم السلام کے بعد اولیاء کرام کا مرتبہ سب سے افضل واعلیٰ

ہے کیونکہ یہ حضرات بمصداق آیت یحبھم و یحبونہ خدائے تعالیٰ کے سچے عاشق بھی ہیں اور اس کے محبوب بھی۔ اولیاء کرام کی جماعت ہر زمانہ میں موجود رہی ہے اور ہمیشہ موجود رہے گی کیونکہ دنیا کا قیام انھیں کے مبارک وجود سے قائم ہے جیسا کہ شیخ پیر علی ہجویریؒ نے اپنی کتاب 'کشف المحجوب' میں فرمایا ہے۔ خدا تعالیٰ کسی وقت بھی زمین کو بے حجت نہیں رکھتا اور اس امت کو بغیر ولی کے نہیں رکھتا۔ اس کے استشہاد میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث شریف بیان فرمائی ہے کہ ''میری امت میں ہمیشہ ایک گروہ ایسا رہے گا جو نیکی پر قائم رہے گا اور میری امت کے چالیس آدمی سنت ابراہیمی پر ہمیشہ قائم رہیں گے۔ پس انبیاء علیہم السلام کے بعد خدا کے نزدیک اس گروہ کے علاوہ اور کوئی نہیں اور اعزاز و اکرام کے اعتبار سے بھی اس گروہ سے زیادہ خدا کے نزدیک کوئی نہیں۔ اس گروہ سے زیادہ نہ کوئی بلند حوصلہ اور عالی ہمت ہو سکتا ہے اور نہ کوئی ایسا بے نیاز اور کامل ترین جیسا کہ اولیاء کاملین کی جماعت ہوتی ہے۔''

(داراشکوہ، سفینۃ الاولیاء، اردو ترجمہ: محمد علی لطفی، نفیس اکیڈمی، اردو بازار، کراچی، مئی 1986، ص 18)

اسی طرح داراشکوہ نے 28 سال کی عمر میں 'سَکِیْنَۃُ الْاَولیاء' کے عنوان سے بہت ہی اہم کتاب تصنیف کی جس میں صوفی شیخ میاں میر، ملا شاہ اور ان کے روحانی شاگردوں کے احوال تحریر کیے ہیں۔ اس کتاب میں انھوں نے پیر ملا شاہ بدخشی (حضرت اخوند) کا ذکر بھی کیا ہے اور میاں میر جیو کا بھی جو ان کے پیر تھے جن کے تئیں ان کے دل میں بڑی عقیدت و محبت تھی۔

اس کتاب کی تصنیف کی بابت داراشکوہ لکھتے ہیں کہ:

''25 سال کی عمر میں بروز پنج شنبہ میں سو رہا تھا کہ ہاتف غیب کی صدا آئی اور چار بار اس کی تکرار ہوئی کہ جو بات روئے زمین کے بادشاہوں کو میسر نہیں آئی وہ خداوند تعالیٰ نے مجھے عطا کی۔ خواب سے بیدار ہوا تو میں نے اپنے آپ سے کہا کہ یہ سعادت البتہ عرفان الٰہی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے مجھے یہ دولت بخشی ہے۔ عطائے محبت سب عطاؤں سے بہتر ہے جو بے مثل، بے بہا، کمیاب اور نادر ہے۔ یہ نعمت اس کے رحم اور بے نہایت عنایت کا ثمرہ ہے۔ اس دولت کا میں ہمیشہ سے طالب تھا۔ یہاں تک کہ مجھے 1049ھ میں بیس سال کی عمر میں ماہ ذی الحجہ کی 12 تاریخ کو ایک حبیب خدا کی صحبت میں حاضر ہونے کا شرف حاصل ہوا جو مجھ پر ایسے مہربان ہوئے کہ جو بات دوسروں کو مہینے بھر میں حاصل ہو سکتی تھی وہ مجھے پہلی رات میں نصیب ہوگئی اور جو بات کسی کو سال بھر میں میسر آتی تھی، وہ مجھے ایک ماہ میں میسر آ گئی اور جو بات کسی طالب کو سالہا سال کی ریاضت و مجاہدہ میں حاصل ہوئی تھی وہ مجھے بغیر ریاضت کے مل گئی۔ اس وقت دونوں جہانوں کی محبت یکبارگی میرے دل سے نکل گئی اور فضل و رحمت کے دروازے مجھ پر کھل گئے جو میں چاہتا تھا وہ مجھے مل گیا۔ اس وقت اگرچہ میں اہل ظاہر سے تعلق رکھتا ہوں لیکن حقیقت میں اہل ظاہر میں سے نہیں بلکہ میں نے اہل ظاہر کی بے حرمتی اور آفت کو سمجھ لیا ہے۔ اگرچہ میں درویشوں سے دور ہوں لیکن میں انھیں میں سے ہوں۔ صاحب کشف المحجوب (حضرت علی ہجویری داتا گنج بخش) فرماتے ہیں ''آدمی مال و دولت کی زیادتی کی وجہ سے دنیادار نہیں ہوتا اور مال و متاع کی کمی کی وجہ سے وہ فقیر نہیں ہوتا۔ جو شخص فقر کو افضل سمجھتا ہے غنا اسے دنیادار نہیں ہونے دیتا، خواہ وہ بادشاہ ہی ہو۔ جو شخص فقر کا منکر ہو وہ دنیادار ہوتا ہے خواہ وہ مفلس ہی کیوں نہ ہو۔''

(داراشکوہ، سکینۃ الاولیا، اردو ترجمہ پروفیسر مقبول بیگ بدخشانی، ناز پبلشنگ ہاؤس، پہاڑی بھوجلہ دہلی 6، ص 11-9)

اس کتاب میں قادریہ، نقشبندیہ، چشتیہ اور سہروردیہ سلسلوں کے بارے میں بہت تفصیلی معلومات ہے۔ اسی کتاب میں انھوں نے سانس روکنے کے تعلق سے بھی لکھا ہے جو ہندو یوگیوں کی عبادت کا ایک حصہ ہے۔ اسی طرح مختصر رسالہ 'حق نما' ان کی ایک اہم تصنیف ہے جس میں تصوف اور معرفت کے حوالے سے بڑی عمدہ گفتگو ہے۔ اس میں حکمت عرفانی کے بڑے اہم راز کا انکشاف ہے۔ رسالہ 'حق نما' میں عالم ناسوت، جبروت، لاہوت اور ملکوت کا ذکر ہے۔ اسی کتاب میں انھوں نے 'وحدۃ الوجود' پر بھی گفتگو کی ہے۔ اس باب میں ان کا نظریہ ابن عربی عبدالکریم جیلی سے ملتا جلتا ہے۔ اس کتاب بتایا ہے کہ سالک کا دل غیر اللہ سے خالی ہونا چاہیے۔ اسلامی عرفان اور ہندو ویدانت کے درمیان اس میں اشتراک پر گفتگو ملتی ہے۔ 'حَسَنَاتُ الْعَارِفِیْن' میں بھی انھوں نے مختلف صوفیاء کے اقوال کو جمع کیا ہے اور اس کتاب میں یہ وضاحت کی ہے کہ میں نے یہ اقوال اس لیے جمع کیے تاکہ میرے اوپر کفر کا الزام لگانے والے عبرت حاصل کریں۔ اس کتاب میں انھوں نے بایزید، ذُوالنون مصری، عبدالقادر جیلانی کے علاوہ بابا لال یوگی کے زریں اقوال بھی تحریر کیے ہیں اور یہ واضح کیا ہے کہ روحانیت کی حقیقت کیا ہے اور روحانیت کے مدارج کیسے طے کیے جا سکتے ہیں؟

داراشکوہ کا وژن بہت وسیع تھا۔ انھوں نے ہندوستانی معاشرے کو ایک نئی سوچ ایک نئی روشنی دی اور یکجہتی کی اس روایت کو قائم کرنے کی کوشش کی جس کا سلسلہ اکبر کے زمانے سے شروع ہو گیا تھا کہ انھیں کے عہد میں ابوالفضل نے 'مہابھارت اور 'رامائن' کا فارسی میں ترجمہ کیا تھا۔ اس کے بعد ہی اس کے ترجمے انگریزی میں کیے گئے تھے۔ تو اس طرح اکبر کی رواداری کی اُس روایت کو داراشکوہ نے آگے بڑھانے کا کام کیا۔

داراشکوہ ایک باعمل صوفی شاعر تھا جس کے سینے میں ایک گداز دل تھا۔ اس کا ایک دیوان بھی ہے اور اس کی رباعیات بھی مشہور ہیں جن کے اردو میں ترجمے ہو چکے ہیں۔ انہی کا مشہور شعر ہے:

بہشت آں جا کہ ملائی نہ باشد
ز ملا شور و غوغائی نہ باشد

''جنت وہ جنت ہے جہاں نہ ملا ہوگا اور نہ ہی اس کا شور و غوغا۔''

داراشکوہ نفرت اور تشدد کا قائل نہیں تھا بلکہ خدمت خلق پر اس کا یقین تھا جو اہل تصوف کا بنیادی مقصد اور منشور ہے۔ دراصل اسی خدمت خلق اور انسانیت کے جذبے نے انھیں تصوف کی طرف مائل کیا تھا۔ وہ تصوف جو دلوں کو توڑتا نہیں بلکہ جوڑتا ہے اور داراشکوہ نے اپنی پوری زندگی جوڑنے کے اسی عمل سے اپنے آپ کو جوڑے رکھا۔ آج جو احترامِ ادیان کی باتیں ہوتی ہیں دراصل سب سے پہلے یہ تصور داراشکوہ نے ہی دیا تھا۔ آج ضرورت ہے کہ اس تصور کو عام کیا جائے اور اس طرح داراشکوہ کے خواب کو حقیقت میں بدلا جائے۔

حوالے

1. داراشکوہ، سفینۃ الاولیاء، اردو ترجمہ: محمد علی لطفی، نفیس اکیڈمی، اردو بازار، کراچی، مئی 1986
2. داراشکوہ: سکینۃ الاولیاء، اردو جمہ: پروفیسر مقبول بیگ بدخشانی، ناز پبلشنگ ہاؤس، پہاڑی بھوجلہ، دہلی 6
3. داراشکوہ: مجمع البحرین، مرتبہ: محمد محفوظ الحق، ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، کلکتہ 1929
4. داراشکوہ: مجمع البحرین، مترجم: پروفیسر طلحہ رضوی برق، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، 2019
5. حافظ کرناٹکی: ہندوستان صوفی اور سیکولر شہزادہ: داراشکوہ، فرید بک ڈپو، دریا گنج، نئی دہلی 2، جولائی 2019
6. محمود علی: داراشکوہ، سلیم پور، دہلی مارچ 1999
7. شکیل الرحمٰن: محمد داراشکوہ، نرالی دنیا پبلی کیشنز، نئی دہلی 2012
8. محمد سلیم: داراشکوہ: احوال و افکار، مکتبہ کارواں لاہور،
9. عادل اسیر: رباعیات داراشکوہ، ملک بک ڈپو، ترکمان گیٹ، دہلی، 2011

☆☆

ڈاکٹر عابد حسین حیدری



آزادی کے بعد اردو افسانے میں تحریک آزادی کی گونج

اردو ادب نے جدوجہد آزادی میں جو کردار ادا کیا ہے اس کا اندازہ اس بات سے آسانی کے ساتھ لگایا جا سکتا ہے کہ اردو کی کوئی بھی صنف ایسی نہیں ہے جس میں تحریک آزادی یا حب الوطنی کا اظہار نہ ہوا ہو۔ خالص غزل گو شاعر بھی 'مشق سخن' کے ساتھ 'چکی کی مشقت' میں حصہ لیتے رہے ہیں اور جنھوں نے چکی کی مشقت میں حصہ نہیں لیا وہ بھی یہ کہہ کر اپنی اس آرزو کا اظہار کرتے رہے:

شاعر نہیں ہے وہ جو غزل خواں ہے آج کل

جب غزل جیسی نازک اور لطیف صنف سخن میں معشوق کی باتوں کے بجائے چکی کی مشقت کی باتیں ہوئی ہوں تو اردو فکشن خصوصاً افسانے میں تحریک آزادی کا عنصر نہ ہو یہ ناممکن ہے۔ اردو فکشن کے ممتاز ناقد اور افسانہ نگار مرزا حامد بیگ نے پریم چند کے افسانوں 'عشق دنیا اور حب وطن' کو تحریک آزادی کے سلسلہ کے افسانوں میں نقش اول قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ 'انگریزی راج کے خلاف اس کی تیزی اور تپش کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جا سکتا ہے کہ جس مجموعے 'سوز وطن' میں یہ افسانہ شامل کیا گیا اسے اشتعال انگیز قرار دے کر کتاب کی بکی ہوئی تین سو کاپیاں چھوڑ کر بقیہ سات سو کاپیاں ضبط کر کے جلا دی گئیں'۔ ان کا خیال ہے کہ 'اردو ادب میں وطن پرستی کے حوالے سے یہ اولین بھرپور آواز تھی'۔(۱)

یہ دور ہندوستان کی ذہنی، سیاسی، تہذیبی اور سماجی زندگی کو نئی کروٹ دے رہا تھا۔ قومیت اور قومی تہذیب کے جن نئے تصورات نے یورپ میں بال و پر نکالے تھے۔ انہیں حکومتی سطح پر ہندوستان میں پنپنے سے روکا جا رہا تھا۔ ہندوستانی قلمکاروں کی تحریروں پر کڑی نظر رکھ کر سختی سے نمٹنے کا فیصلہ کیا گیا تھا اور اس طرح پہلی جنگ آزادی (۱۸۵۷ء) کے بعد انگریز سامراج کی پوری کوشش تھی کہ ان کی ہندوستانی رعایا متحدہ قومیت اور وسیع تر قومی مفاد کے مشترکہ احساس وشعور سے بیگانہ رہے۔ انگریزی تسلط کے سبب ہندوستان کا صدیوں کا دیہی سیاسی نظام کس طرح تباہ ہوا اور اس تباہی کے کیا نتائج برآمد ہوئے، یہ ایک الگ موضوع ہے۔ لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ ہمارے افسانہ نگاران حالات سے بخوبی واقف تھے اور اپنے افسانوں میں ان عناصر یا دوسرے لفظوں میں تحریک آزادی کے عناصر کو نمایاں کرتے رہے۔ خلافت تحریک سے پہلے کے افسانہ نگاروں کی تخلیقات کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ ہمارے پہلے افسانہ نگار راشد الخیری کے پیش نظر (باوجود اس کے کہ وہ سرسید تحریک کے پروردہ تھے) بھی عالمی سیاسی منظر نامہ تھا اور مسلم سماج کی اصلاح کے ساتھ ساتھ تحریک آزادی کے پہلو کو بھی اپنے افسانوں میں نمایاں کرتے رہے اس لئے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ راشد الخیری اور سلطان حیدر جوش نے پریم چند سے بہت پہلے حب الوطنی یا تحریک آزادی کے عناصر کو اپنے افسانوں میں جگہ دی۔ راشد الخیری کا افسانہ 'سیاہ داغ'، مشمولہ شہید مغرب' تحریک آزادی کے حوالے سے خصوصی توجہ کا طالب ہے۔ یہ افسانہ واضح طور پر جلیاں والا باغ کے عظیم سانحہ سے متعلق ہے۔ جس میں ہندوستان کی آزادی کا خواب دیکھا اور دکھایا گیا ہے:

''عدل ورحم شہر کی چار دیواری سے کوسوں دور بھاگ چکا تھا۔ مسلح دستوں نے گولیوں کی بوچھاڑ شروع کی۔ الیاس آباد کا دولہا، بیوہ کا لال، جورہ رہ کر کہہ رہا تھا ہم کچھ نہیں کہتے، فقط ہمارے بچے حوالے کر دو۔ وہ اپنی درخواست کے جواب میں فیر کی آواز سنتا اور دیکھتا ہے کہ چہرے سے خون بہنے لگا۔ صداقت کا پتلا اور اسلام کا عاشق، وطن کا شیدا قدم پیچھے نہیں ہٹاتا اور کہتا ہے کہ اس خون کے ہر قطرے سے وطن پرست جماعت پیدا ہوگی۔ یہ خون ضائع نہ جائے گا اور عنقریب وہ وقت آئے گا جب ملک اس خون پر خود قربان ہوگا۔''

راشد الخیری کے تین افسانے 'شہید مغرب، طرابلس سے ایک صدا' اور دولہن دونوں کی' جہاں عالمی سیاسی منظر نامے کے ترجمان ہیں وہیں ان کا افسانہ 'کلونتیاں' ہندو مسلم کشیدگی اور فرقہ واریت پر آزردگی کا کھلا اور برملا اظہار ہے اور یہ ثابت کرتا ہے کہ راشد الخیری ہندو مسلم اتحاد کے خواہاں تھے اور انگریزوں کے خلاف انھیں متحد ومنظم دیکھنا چاہتے تھے۔

اردو افسانے میں اصلاح پسندی اور قوم پرستی کے حوالے سے دوسرا بڑا نام سلطان حیدر جوش کا ہے جنھوں نے پریم چند سے پہلے اپنے افسانے 'خواب و خیال' میں تحریک آزادی کے عنصر کو بہت سلیقے سے پیش کیا ہے:

''پہلے وہ کالے کتے کو نجس اور ذلیل جانتا تھا اب کالے آدمی کو اس سے بھی زیادہ ذلیل مانتا ہے۔''

لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بیسوں صدی کی ابتدا میں تحریک آزادی کے عناصر کو سب سے زیادہ اپنے افسانوں میں جگہ دینے والے پریم چند ہیں انھوں نے اپنے افسانوں میں فرقہ واریت اور استحصال کو طنز کا نشانہ بنایا۔ انھوں نے اپنے ایک ہندی مضمون میں اپنے نظریات کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا:

''فرقہ واریت ہمیشہ تہذیب کی دہائی دیا کرتی ہے۔ اسے اپنے اصلی روپ میں نکلتے شاید شرم آتی ہے۔ اس لیے وہ (اس) گدھے کی طرح ہے جو شیر کی کھال اوڑھ کر جنگل کے جانوروں پر رعب جماتا پھرتا ہے۔ فرقہ واریت

پرنسپل ایم جی ایم کالج، سنبھل (یوپی)
فون:9411097150 drabidhusain@gmail.com

تہذیب کا خول پہن کر آتی ہے۔ ہندو اپنی تہذیب کو قیامت تک محفوظ رکھنا چاہتا ہے، مسلمان اپنی تہذیب کو۔ دونوں ہی ابھی تک اپنی اپنی تہذیب کو اچھوتی سمجھ رہے ہیں۔ یہ بھول گئے ہیں کہ اب نہ کہیں مسلم تہذیب ہے نہ ہندو تہذیب، نہ ہی کوئی دوسری تہذیب۔ اب دنیا میں صرف ایک تہذیب ہے اور وہ ہے اقتصادی تہذیب۔'' (۲)

یہی نہیں پریم چند نے مستقبل کے ہندوستان کو آزاد خیال اور پرامن دیکھنے کے لئے، ہر قسم کے نسلی تفاخر کو ختم کرنے کے لئے سماجی ڈھانچے میں موجود خرابیوں کی نشان دہی کی اور نجات (1933) نامی افسانہ لکھ کر یہ الزام اپنے سر لیا کہ وہ طبقاتی منافرت پھیلانے والوں کے خلاف اعلان جنگ کر رہے ہیں۔ پریم چند نے اپنے پہلے مطبوعہ افسانہ 'عشق دنیا اور حب وطن' میں ہی انگریزی سامراج کے خلاف قلم اٹھایا جو اردو ادب میں وطن پرستی یا تحریک آزادی کی بھرپور آواز تھی۔ بعد میں پریم چند ہندوستان کی آزادی کے نقیب بن گئے اور ان کے افسانوں میں انقلاب کے قدموں کی چاپ اور دم توڑتے ہوئے مجاہدین کی للکار صاف سنائی دینے لگی:

''افسوس ہے کہ تو یہاں ایسے وقت آیا جب ہم تیری مہمان نوازی کرنے کے قابل نہیں۔ ہمارے بابا دادا کا دیس آج ہمارے ہاتھ سے نکل گیا اور اس وقت ہم بے وطن ہیں۔ مگر (پہلو بدل کر) ہم نے حملہ آور غنیم کو بتا دیا کہ راجپوت اپنے دیس کے لئے کیسی بے جگری سے جان دیتا ہے۔ یہ آس پاس جو لاشیں تو دیکھ رہا ہے یہ ان لوگوں کی ہیں جو اس تلوار کے گھاٹ اترے ہیں (مسکرا کر) اور گو کہ میں بے وطن ہوں مگر غنیمت ہے کہ حریف کے حلقے میں مر رہا ہوں (سینے کے زخم سے چیتھڑا نکال کر) کیا تو نے یہ مرہم رکھ دیا۔ خون نکلنے دے۔ اسے روکنے سے کیا فائدہ؟ میں اپنے ہی وطن میں غلامی کے لئے زندہ رہوں، نہیں، ایسی زندگی سے مرنا اچھا۔ اس سے بہتر موت ممکن نہیں۔'' (دنیا کا سب سے انمول رتن)

افسانے کا اختتام یوں ہوتا ہے 'وہ آخری قطرۂ خوں جو وطن کی حفاظت میں گرے دنیا کی سب سے بیش قیمتی شے ہے۔'

پریم چند کے افسانوں میں سیاسی دور تک آتے آتے تحریک عدم تعاون، خلافت تحریک، کسان آندولن، ستیا گرہ اور سول نافرمانی کی تحریکیں اپنے عروج تک پہنچتی ہیں اور افسانے میں بقول آل احمد سرور، پریم چند جھنڈا یا نشان بن گیا۔ پریم چند نے اپنے اس انقلابی مشن میں ادیبوں سے بھی مدد مانگی۔ انھوں نے اپنے ایک خط میں لکھا:

''ادیبوں اور دانشمندوں کو عوام کے دکھ درد میں ہاتھ بٹانا ہوگا۔ اس کے بعد ہی وہ امن اور کامرانی کی تلاش کر سکتے ہیں۔'' (۳)

درج بالا خط کے حوالے سے مرزا حامد بیگ کا خیال ہے کہ 'جب جب تحریک آزادی کا مطالعہ کیا جائے گا تو سیاسی تحریکوں اور سیاسی راہنماؤں کی پالیسیوں کے ساتھ پریم چند کے افسانوں کا مطالعہ بھی ناگزیر ہوگا۔'

پریم چند کے بعد تحریک آزادی کے نقیب کے حیثیت سے اردو افسانہ نگاروں میں اہم نام مہاشہ شدرشن کا ہے۔ مہاتما گاندھی کے افکار کی جھلک ان کے افسانوں میں جگہ جگہ دکھائی دیتی ہے۔ ان کے افسانے وزیر عدالت، جانثار اور آزمائش تحریک آزادی کے افسانوں میں یادگار رہیں گے۔ اسی کے ساتھ خواجہ حسن نظامی اور چودھری محمد علی ردولوی افسانے کا رشتہ داستان سے جوڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔ محمد علی ردولوی کے افسانے 'گناہ کا خوف، آنکھوں کی زبان' اور 'تیسری جنس' جہاں اودھ کی مٹتی ہوئی تہذیب و ثقافت کا کربناک مرثیہ ہے جو نفسیات کے حوالے سے اردو افسانے میں خاصے کی چیز ہے۔ وہیں خواجہ حسن نظامی نے کلی طور پر مٹتی ہوئی ہند اسلامی قدروں کے ساتھ ساتھ اپنے عہد کی ہنگامہ خیز سنگینی کو ایک الگ زاویہ سے دیکھتے ہوئے مٹتی ہوئی مغل تہذیب کا نوحہ رقم کرنے کے ساتھ ساتھ پہلی جنگ آزادی کی تباہی و بربادی کی تاریخ بھی لکھ دی:

''جب انگریزی توپوں نے، کرچوں اور سنگینوں نے، حکیمانہ جوڑ توڑ کے تخت پر قبضہ کر لیا۔ اس وقت میں نے بھی بوڑھی والدہ، کمسن بہن اور حاملہ بیوی کو ساتھ لیکر اور اجڑے قافلے کا سالار بن کر گھر سے کوچ کیا۔ ہم لوگ دو رتھوں میں سوار، سیدھے غازی آباد کا رخ کیا مگر بعد میں معلوم ہوا کہ وہ راستہ انگریزی لشکر کی جولاں گاہ بنا ہوا ہے۔ اس لئے شاہدرہ سے واپس ہو کر قطب صاحب چلے اور وہاں پہنچ کر تمام رات آرام کیا۔ اس کے بعد صبح آگے روانہ ہوئے۔ چھترپور کے قریب گوجروں نے حملہ کیا اور سب سامان لوٹ لیا مگر اتنی مہربانی کی کہ ہم کو زندہ چھوڑ دیا۔ لق و دق جنگل میں عورتوں کے ساتھ اور عورتیں بھی کیسی۔''

(دہلوی تاج دار کے ایک کنبہ کا فسانہ از خواجہ حسن نظامی سے اقتباس)

خواجہ حسن نظامی کے بعد ہمارے افسانہ نگاروں میں میرزا ادیب کے افسانوں میں برطانوی راج اور سماجی گھٹن کی نشان دہی کی جا سکتی ہے۔ ان کے افسانے نئے انسان، غلاموں کی بغاوت، دیا اور روشنی میں تحریک آزادی کی بازگشت سنائی دیتی ہے:

''میری طرف ہزاروں، لاکھوں انسان تاریخ کے بھاری بوجھ کے نیچے کچلے جا رہے ہیں۔ روشنی کے بغیر جنیا، یہ کیا جینا ہے۔ یہ کیا زندگی ہے۔ تمسخر، مذاق، بے دردی۔ انسان روشنی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔''

(افسانہ روشنی سے اقتباس)

اس کے بعد انگارے گروپ کا باغیانہ لحن ہمارے افسانوں میں نئے ڈھنگ و آہنگ سے روشناس کراتا ہے۔ سید سجاد ظہیر نے 'روشنائی' میں اس پر تفصیل سے روشنی ڈالی، وہ لکھتے ہیں:

''انگارے اور اس کے مصنفین کے خلاف سخت پروپیگنڈا کیا گیا، حسب دستور مسجدوں میں ریزولیوشن پاس ہوئے۔ عبدالماجد دریابادی خم ٹھونک کر ہمارے خلاف اکھاڑے میں آ گئے۔ ہمیں قتل کرنے کی دھمکی دی گئی اور بالآخر صوبہ متحدہ کی حکومت سے اس کتاب کو ضبط کروایا گیا۔''

(روشنائی سے اقتباس)

'انگارے' کی اشاعت کے خلاف اتنا شدید ردعمل دیکھنے میں آیا کہ لوگوں نے انگارے کی کاپیاں بک اسٹالوں سے اٹھا کر مختلف شہروں میں نذر آتش کیں۔ انگارے کے تمام افسانہ نگاروں کو مذہب دشمن کہا گیا اور مشرقی روایات کے ان باغیوں کا سماجی بائیکاٹ بھی کیا گیا۔ اس مجموعے کی ضبطی سے ظاہر ہوتا ہے کہ سیاسی جدوجہد اور سماجی جکڑ بندیوں کے خلاف اندر ہی اندر پلنے والی تحریک ایک نئے مرحلے تک آن پہنچی تھی۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ سجاد ظہیر، احمد علی، رشید جہاں اور محمود الظفر کے ان افسانوں میں زیریں لہر کمیونزم کی ہے اور روحانی اعتقادات پر کاری ضربیں لگائی گئی ہیں لیکن اس جدوجہد اور سماجی جکڑ بندیوں پر طنز کے پس پشت آزادی کی بازگشت بھی سنائی دیتی ہے۔ سجاد ظہیر کے افسانے 'نیند نہیں آتی' کے درج ذیل جملے ملاحظہ فرمائیں:

موت یا آزادی؟
مجھے موت پسند نہ آزادی، کوئی میرا پیٹ بھر دے۔
اڑ گئی سونے کی چڑیا، رہ گئی دم ہاتھ میں۔اب چاہتے ہیں کہ دم بھی ہاتھ سے نکل جائے۔دم نہ چھوٹنے پائے۔
شاباش اے میرے پہلوان! لگائے جا زور! دم چھوٹ گئی تو عزت گئی۔
کیا کہا! عزت؟ عزت لیکے چاٹنا ہے۔سوکھی روٹی اور نمک کھا کر کیا بانکا جسم نکل آیا ہے۔فاقہ ہوتو ہو پھر کیا کہنا، اور اچھا ہے، پھر تو عزت ہے اور عزت کے اوپر خداوند پاک۔

اسی طرح احمد علی کے افسانہ 'مہاوٹوں کی رات' میں بھی تحریک آزادی کی گونج محسوس کی جاسکتی ہے:

'سرکار ہی کچھ کیوں نہیں کرتی؟ اور نہیں تو سب کو برابر روپیہ دلوا دے اور اگر اتنا نہیں تو صرف آدھا ہی ہم کو مل جائے لیکن سرکار کی جوتی کو کیا غرض پڑی جو اپنی جان ہلکان کرے۔اس کے خزانے تو پر ہیں۔'

رشید جہاں نے ہندوستان کی پہلی ترقی پسند خاتون ہونے کے ناطے اپنے افسانوں میں جرأت فکر اور جرأت بیان کا مظاہرہ کیا ہے۔

سعادت حسن منٹو اردو فکشن کا ایک ایسا نام ہے جس نے اپنی تمام تخلیقات میں کبھی واضح اور کبھی ایمائی انداز میں جبر کی ہر اس طاقت کے خلاف اپنی نفرت کا اظہار کیا ہے جو فرد کی آزادی کو سلب کر لے اور جو کسی طبقے یا کسی ملک کو غلام بنائے۔اس نظریہ کے تحت یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ان کے افسانے تحریک آزادی کے نمائندہ افسانے ہیں۔یہ عنصر ان کے بالکل ابتدائی کہانی 'تماشا' سے لیکر تخلیقی زندگی کے آخری زمانے میں لکھے گئے 'پچاسام کے نام خطوط' تک وہ بہت واضح طور پر نظر آتے ہیں۔منٹو کے ابتدائی افسانے تماشا اور 'نیا قانون' دونوں میں استعماری قوت کے خلاف جذبات کی شدت بہت نمایاں ہے۔حالانکہ افسانے میں انگریز حاکموں کا ذکر کہیں نہیں آیا ہے لیکن انھوں نے ان حکام کو ایک ایسے طاقت ور بادشاہ کے طور پر پیش کیا ہے جو اپنی طاقت اور اختیار میں خدا کے فوراً بعد کی حیثیت رکھتا ہے۔بادشاہ کے خلاف خالد کا غصہ اور ان کے والد کا اپنی قوت کا احتساب تحریک آزادی کا مناسب عنصر کہا جاسکتا ہے۔ایک جگہ راوی اس خواہش کا اظہار کرتا ہے کہ کاش یہ چھوٹی سی دشمنی ہر شخص میں بنٹ جاتی۔منٹو کا افسانہ 'نیا قانون' (۱۹۳۶ء) روسی انقلاب سے پیدا ہونے والی امید افزا صورت حال میں تخلیق ہوا ہے۔روسی انقلاب کا ہماری تحریک آزادی میں اہم رول رہا ہے۔اور اس انقلاب سے متاثر ہوکر بہت سے ادیبوں اور شاعروں نے ادب آزادی کی تخلیق کی۔سرحدوں پر لال قمیص کی تحریک اور انڈیا ایکٹ سے وابستہ امیدیں منگو کوچوان کو آزادی کے جہانِ تخیل میں لے جاتی ہے۔اور برطانوی حکومت کے ظالمانہ نظام کے خلاف احتجاجی واقعہ کو افسانے میں ڈھالا گیا ہے۔اس طرح یہ کہا جاسکتا ہے کہ منٹو نے اپنے افسانوں میں تحریک آزادی کے عناصر کو بخوبی پیش کیا ہے۔

کرشن چندر اردو کے ایسے افسانہ نگار ہیں جو طبعاً رومان پسند ہیں تاہم ان کی معروضیت گہرے شعور کی آئینہ دار ہے۔ان کا یہ شعور انھیں اپنے افسانوں میں تحریک آزادی کو بڑی خوبصورتی سے سمو دیتا ہے جس کی نمایاں مثال 'پشاور ایکسپریس، ان داتا' اور 'امرتسر آزادی سے پہلے اور آزادی کے بعد' ہے۔کرشن چندر کے ساتھ ہی بیدی ایک ایسے افسانہ نگار ہیں جنھوں نے اپنے افسانوں میں بنیادی اہمیت اپنے تجربے کو دی ہے۔اور اس کی گہرائی سے صداقت اور معنویت خود بخود افسانے کا حصہ بن گئی ہے۔

تقسیم وطن سے ادیبوں کو جو ایک خاص طرح کا صدمہ پہنچا تھا اس کے ردعمل کے طور پر بھی کچھ افسانے لکھے گئے۔اس ضمن میں کرشن چندر کا افسانہ 'باپو کی واپسی' قابل ذکر ہے۔منٹو کا 'ٹوبہ ٹیک سنگھ' بھی بٹوارے پر گہرا طنز ہے۔ٹوبہ ٹیک سنگھ کا کردار منٹو کی خلاقانہ ذہنیت کا جیتا جاگتا نمونہ ہے۔منٹو نے اس کردار کے ذریعہ سماج کے باشعور ٹھیکیداروں کو اپنا نشانہ بنایا ہے ایک طرف تقسیم کا المیہ ہے جو ایک پاگل کے لئے بھی کسی طرح قابل قبول نہیں اور وہ احتجاج کے طور پر اپنا بامعنیٰ ردعمل بھی ظاہر کرتا ہے لیکن دوسری طرف سماج کے نام نہاد مہذب لوگ ہیں جنھوں نے بے حسی کی ردائیں اوڑھ رکھی ہیں اور انسانیت کا گلا گھوٹنے میں پیش پیش ہیں۔اس سے پہلے منٹو نے 'نیا قانون' لکھ کر طنز کے تیر و نشتر کا بھرپور استعمال کیا ہے۔

آزادی اور تقسیم وطن کے بعد جو افسانے لکھے گئے ان میں بھی سماجی بے راہ روی کی بہترین عکاسی کی گئی ہے۔ملک کی تقسیم کے بعد بھی عوامی مسائل جوں کہ توں تھے۔ وہی اقتصادی بدحالی، وہی ظلم و جبر، وہی زمینداروں کا تسلط، وہی بے روزگاری اور وہی طبقاتی کشمکش۔لہٰذا آزادی کے بعد بھی ان موضوعات پر پورے شد و مد کے ساتھ لکھا گیا۔آزادی اور جمہوریت کے باوجود افلاس کے جو کربناک رخ سامنے آئے وہ اس دور کے افسانوں کے موضوعات بنے۔اب ادب، زندگی اور انسان کا تصور بدل گیا ہے اور زندگی کی کوئی معنویت نہیں۔ہم سب اجنبی ہیں، جلاوطن اور تنہائی کا شکار، دہشت کے مارے ہوئے بے یار و مددگار انسان کا نیا تصور سامنے آیا۔ازالہ سحر کے باوجود سوال یہ ہے کہ انسان کا اصلی چہرہ کون سا ہے؟ وہ فرشتہ سیرت ہے یا شیطان خصلت۔مشیت ایزدی کا غلام یا جبلت اور مادی معیشت کا قیدی۔وہ اشرف المخلوقات اور مرکز کائنات ہے یا ایک ادنیٰ حقیر ذرہ۔اور اس طرح آدرش کے فقدان، تہذیبی زوال، تنہائی کے احساس اور زندگی کے بے معنیٰ اور لغو ہونے کے تصورات میں ہمارے افسانے کو کافی متاثر کیا۔

ہمارے افسانہ نگاروں نے تقسیم اور ہجرت کے المیہ پر گراں قدر افسانے تخلیق کئے وہیں اس کے پس منظر میں تحریک آزادی کے محرکات و عوامل کو بھی بیان کیا۔آزادی کے بعد جن افسانہ نگاروں نے تحریک آزادی کے عناصر کو اپنی تخلیقات میں جگہ دی، ان میں عصمت چغتائی، قدرت اللہ شہاب، سہیل عظیم آبادی، بلونت سنگھ اور شمشیر سنگھ نرولا اہمیت کے حامل ہیں۔عصمت کے فن کی غالباً سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنی بصیرت کی ایک نہایت بے باک اور صداقت شعار ترجمان ہیں۔وہ ایک ہندوستانی عورت ہیں اور ابتدائی دور مین ان کی وہ پذیرائی نہیں ہوئی جس کی وہ حقدار تھیں۔یہاں تک کہ چابڑے، مغل بچہ اور گل دان تک آتے آتے عصمت کے افسانوں کے فقروں، کنایوں، آوازوں، اشاروں، کرداروں، احساسات و جذبات کے بلاخیز بہاؤ نے توصیف و تنقید سے بے نیاز رہ کر اپنا ایک الگ جہان خلق کیا ہے جس کی مکین عصمت سب سے الگ اور منفرد مقام پر دکھائی دیتی ہیں۔یہی وجہ ہے کہ اپنے فقروں، کنایوں اور اشاروں میں وہ تحریک آزادی کے عنصر کو قاری تک پہنچانے کا ہنر جانتی ہیں۔مغل بچہ میں ان کی ہنرمندی ملاحظہ فرمائیں:

''انگریزوں نے جب مغل شاہی کا انتم سنسکار کیا تو سب سے بری مغل بچوں پر بیتی کہ وہ زیادہ عہدہ سنبھالے بیٹھے تھے۔جاہ جاگیر چھن جانے کے بعد لاکھ کے گھر دیکھتے دیکھتے خاک ہو گئے۔بڑی بڑی دھندار حویلیوں میں مغل بچے بھی پرانے سامان کی طرح جا پڑے، بھونچکے سے رہ گئے جیسے کسی نے پیروں تلے سے تختہ کھینچ لیا۔''

احمد ندیم قاسمی اور بلونت سنگھ نے اپنے اولین مجموعوں چوپال اور جگا کے بعد حقیقت نگاری کے سہارے تحریک آزادی کے عناصر کو اپنے افسانوں میں جگہ دی۔احمد ندیم قاسمی کا

'پریمیشر سنگھ' اور بلونت سنگھ کا 'دیش بھگت' اس کی عمدہ مثال ہے۔

قرۃ العین حیدر کا منفرد انداز تحریر اور تاریخ کے گہرے مطالعے نے ان کے فکری افق کو جلا بخشی ہے۔ ان کے افسانوں میں واضح طور پر نہ سہی لیکن ضمنی طور پر تحریک آزادی کے عناصر محسوس کئے جا سکتے ہیں۔ جس کی خوبصورت مثالیں 'فصل گل آئی یا اجل آئی'، یہ داغ داغ اجالا اور جب طوفان گزر گیا ہے لیکن ان کے افسانہ 'جلاوطن' میں تحریک آزادی کے عناصر کو بخوبی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ عوام میں انگریزوں سے نفرت کو چھمو بیگم کی زبانی مجلس میں قرۃ العین حیدر کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں:

''اے بی بیو! یہ جو انگریزی داں دہریے خدا کے منکر ہیں۔ ان کا احوال مجھ سے سنو اور کان کھول کر سنو، کہ خداوند کریم ان سب شیطانی وسوسوں اور چالوں سے واقف ہے جو فرنگیوں کے ذریعہ ابلیس ملعون نے تم مسلمانوں کے دلوں میں ڈال دی ہیں۔''

قرۃ العین حیدر کی تاریخی اور تہذیبی شعور کے ساتھ ساتھ ہندوستانی سیاست اور تحریک آزادی پر گہری نظر ہے۔ 'جلاوطن' میں انہوں نے کانگریس کی صوبائی حکومت میں شرکت کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریک آزادی کے اس اہم موڑ کی بھی نشان دہی کی:

''کشوری کے بابا سید جعفر عباس ڈپٹی کلکٹر تھے لیکن دل کے بڑے پکے قوم پرست مسلمان تھے۔ جب کانگریسی وزارت قائم ہوئی تو آپ نے بھی خوب خوب خوشیاں منائیں۔ حافظ ابراہیم ضلع میں آئے تو آپ مارے محبت کے جا کے ان سے لپٹ گئے۔''

درج بالا سطور میں آزادی سے قبل سے لے کر آزادی کے بعد تک کے کچھ اہم افسانوں میں تحریک آزادی کے عنصر کی نشان دہی کی گئی ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ہمارا افسانہ ابتدا سے لے کر آج تک حب الوطنی اور قومی یکجہتی کے جذبہ سے مملو تھا جس کے سبب اردو افسانوں میں تحریک آزادی کے عناصر کی جا بجا عکاسی ملتی ہے۔ ہمارا افسانہ ہر دور میں سماج دشمن، وطن دشمن اور انسانیت دشمن عناصر کے خلاف نبرد آزما رہا اور آج بھی ان عناصر کے خلاف محاذ آرائی میں مصروف ہے۔

ہندوستان کی تقسیم کے کرب نے جہاں بہت سی اچھی کہانیوں کو جنم دیا تو ان کہانیوں میں تحریک آزادی کی بازگشت بھی سنائی دی۔ رتن سنگھ کی کہانی پناہ گاہ اسی قبیل کی کہانی ہے۔ ممتاز شیریں کے افسانوں میں 'آزادی کی صبح' کو یہ انفرادیت حاصل ہے کہ انہوں نے یہ افسانہ اس دور میں لکھا جب پورے ملک کے ترقی پسند ادباء و شعراء تقسیم ملک کو داغ داغ اجالا اور کسی شب گزیدہ سحر کے طور پر دیکھ رہے تھے لیکن ممتاز شیریں نے اس حقیقت کو کھلے دل سے قبول کیا بلکہ اس کا خیر مقدم بھی کیا۔ آزادی کے بعد یہ ان کا پہلا افسانہ ہے جس میں ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد سے لے کر انگریزی حکومت تک، پھر تقسیم تک کے واقعات کو تمثیلی پیرایہ بیان اختیار کرتے ہوئے نہایت دلکش انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ انہوں نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ جب مسلمان یہاں آئے تو انہوں نے ابتدا ہی سے اس ملک کو اپنا ملک سمجھا اور اسی کے ہو کر رہ گئے۔

ابن کنول نے 'بند راستے' افسانہ لکھ کر یہ ثابت کیا ہے کہ وہ نسل جو آزادی کے بعد پیدا ہوئی ہے وہ بھی اسی لعنت کا شکار ہے جو آزادی سے پہلے تھی۔ اس کرب کی عکاسی کرنے میں ابن کنول نے تحریک آزادی کے اس کربناک دور کی یاد دہانی کرائی ہے جس سے سامراجی دور کا ہندوستانی گزر رہا تھا۔ سید محمد اشرف کی کہانی 'ڈار سے بچھڑے' میں بھی جنگ آزادی کی یاد کے ساتھ وطن کی محبت کا عنصر نمایاں ہے۔ سید محمد اشرف نے اس افسانے میں مجبوری میں ہجرت کرنے والے لوگوں کی اس کیفیت کو بیان کیا ہے کہ آج بھی مادر وطن کی یاد ان کے دلوں کو برماتی رہتی ہے۔ انہوں نے ان کی مثال ان پرندوں سے دی ہے جو ڈار سے بچھڑ گئے ہیں۔ اسی طرح حسین الحق کے افسانہ 'نیو کی اینٹ' میں بھی جہاں جڑوں کی تلاش ہے وہیں وطن دوستی اور تحریک آزادی کے عنصر کو بھی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ فکشن نگار اور ناقد ڈاکٹر اسلم جمشید پوری کے افسانوں میں بھی وطن دوستی اور تحریک آزادی کے عناصر کی پیش کش ہے جس کی واضح مثال موجودہ عہد کا مقبول ترین افسانہ 'عیدگاہ سے واپسی' ہے۔

مذکورہ بالا افسانہ نگاروں کے علاوہ نئی مشقت (اقبال مجید) کنکر کنواں (انیس اشفاق) سحر البیانی (عبدالصمد) ڈرفٹ وڈ (دیپک بدکی) جواب دو (غلام نبی شاہد) گنبد کے کبوتر (شوکت حیات) کرفیو سخت ہے (انیس رفیع) اور سنگل (سلام بن رزاق) میں بھی حب الوطنی کے ضمن میں آزادی کی تحریک کی بازگشت محسوس کی جا سکتی ہے۔ ماہنامہ آج کل دہلی کے اگست ۲۰۱۸ء کے شمارے میں ندیم راعی مرادآبادی کا ایک افسانہ 'میں ایک پیڑ ہوں' شائع ہوا ہے۔ جس میں گل شہید کے اس تاریخی پیڑ کو راوی کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے جس پر شہید وطن نواب مجو خاں اور ان کے ساتھیوں کو تختہ دار پر چڑھایا گیا تھا۔ افسانے کا داستانی انداز جہاں سنبھل اور مرادآباد کی وطن دوستی کی تاریخ رقم کرتا ہے وہیں موجودہ عہد تک کے سماجی اور تاریخی واقعات کو بیان کرتے ہوئے خلافت تحریک، ترک موالات، بھارت چھوڑو آندولن میں مرادآباد اور اطراف کے مجاہدین آزادی کی شمولیت کے ساتھ اردو افسانے کی تحریک آزادی سے وابستگی کو بھی ظاہر کرتا ہے۔

موجودہ دور کے افسانہ نگاروں کے یہاں جو تخلیقی کرب ہے اس کا احساس ہر بڑے فن کار کو ہر دور میں ہوتا رہا ہے۔ منٹو کے نیا قانون سے یہ کرب تقسیم کے المیے پر ٹوبہ ٹیک سنگھ کی نئی شکل میں سامنے آتا ہے۔ آزادی کے بعد آزادی کا تصور تبدیل ہو گیا۔ مذہبی شدت پسندی نے ٹیپو سلطان، سراج الدولہ، بیگم حضرت محل ہی کیا، مہاتما گاندھی، امبیڈکر اور نہرو ہی کو ہیرو ماننے سے انکار کر دیا۔ آزادی سے پہلے جو مسائل تھے وہ آج بھی جوں کے توں ہیں ہمارے افسانہ نگاروں نے طبقاتی، معاشرتی اور تہذیبی ہر میدان میں اپنا فریضہ ادا کیا اور وہ کرب جو مغل حکومت کے زوال کے بعد غالب نے محسوس کیا تھا آج بھی ہمارا افسانہ نگار محسوس کر رہا ہے:

ڈھانپا کفن نے داغ عیوب برہنگی
میں ورنہ ہر لباس میں ننگ وجود تھا

ہمیں آزادی تو مل گئی ہے لیکن کیا آج بھی ہم ان مسائل سے دوچار نہیں ہیں جن مسائل سے انگریزی سامراج میں دوچار تھے۔ آج کا افسانہ نگار بھی طبقاتی کشمکش، مذہبی منافرت اور دلتوں و کمزور طبقے کے مسائل کی نمائندگی کر کے اپنا فریضہ ادا کر رہا ہے۔

حوالے:

۱۔ اردو افسانے کی روایت (جلد اول) مرزا حامد بیگ: ایم۔آر پبلی کیشنز: نئی دہلی: 2014:

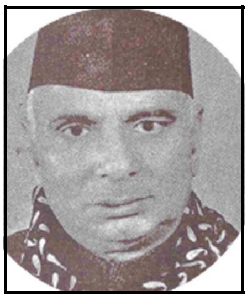
۲۔ پریم چند: قلم کا سپاہی: ص: 538

۳۔ بحوالہ اردو افسانے کی روایت (جلد اول) مرزا حامد بیگ: ایم۔آر پبلی کیشنز: نئی دہلی: 2014: ص 54

☆☆

ڈاکٹر تمثیل احمد





دوارکا داس شعلہ: تلمیذ یگانہ

غیر منقسم ہندوستان کے جس مشترکہ کلچر نے پنڈت رتن ناتھ سرشار، لالہ سری رام، پنڈت کیفی، فراق گورکھپوری، مالک رام، کرشن چندر، آنند نرائن ملا اور دیگر سینکڑوں نامور ہندو ادباء وشعراء کی پرورش کی تھی، اسی نے دوارکا داس شعلہ جیسے منفرد ادیب وشاعر کو بھی پروان چڑھایا۔ وہ 13/اگست 1910 کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ بزرگوں کا وطن مغربی پنجاب کے گوجرانوالہ کا تاریخی قصبہ ایمن آباد تھا۔ جہاں، نندا، وگل اور کوجھڑ جیسے ترقی یافتہ خانوادے آباد تھے۔ شعلہ اسی کوجھڑ خاندان کے ایک روشن چشم و چراغ تھے۔ والد کا نام لالہ نرائن داس اور تخلص شاکر تھا۔ جن کا انارکلی لاہور میں اودیات کا بڑا کاروبار تھا۔

دوارکا داس کی اردو فارسی تعلیم لوہاری مسجد، لاہور کے مکتب میں انجام پائی۔ پھر دیو سماج ہائی اسکول، انارکلی میں وہ نویں درجے کی تعلیم مکمل کر پائے تھے کے والدہ کا انتقال ہوگیا۔ چنانچہ والد نے شعلہ کو اپنے کاروبار میں لگا دیا۔ لالہ نرائن داس گرچہ خود شعر گوئی سے شغف رکھتے تھے مگر اپنے صاحبزادے کو وہ شاعر نہیں تاجر بنانا چاہتے تھے۔ تاہم کاروباری مشغلتوں کے سائے میں شعلہ کا ذوق سخن پروان چڑھتا رہا۔ یعنی وہ دوا کی شیشیاں بھی دھوتے رہے اور شعر بھی گنگناتے رہے۔ اس زمانے میں ابوالاثر حفیظ جالندھری کی شاعری نے ہر طرف دھوم مچا رکھی تھی۔ ابھی تو میں جوان ہوں، ہر کس وناکس گنگنا رہا تھا۔ چنانچہ شعلہ پنڈت ہری چند اختر کی وساطت سے حفیظ جالندھری کے زمرۂ تلامذہ میں شامل ہوگئے۔ اور باضابطہ شاگرد تو وہ حفیظ ہی کے رہے مگر 1926 میں جب مرزا یگانہ، اردو مرکز، لاہور سے وابستہ ہوئے تو ان سے بھی اصلاح سخن کا سلسلہ قائم ہوا جو آگے بھی جاری رہا۔

1947 میں ملک تقسیم ہوگیا۔ اور شعلہ خانماں برباد لاہور سے دہلی ہجرت کر گئے۔ خوش قسمتی سے شعلہ کی مشہور فرم، نرئن داس بھگوان داس کیمسٹ، لاہور کی ایک شاخ قبل سے قرول باغ، ولی میں موجود تھی جو دور ابتلا میں شعلہ کے کام آئی۔ لیکن وقت کا انقلاب بھی شعلہ کے ادبی مشاغل پر اثر انداز نہ ہوسکا۔ چنانچہ شعلہ کا مجموعۂ کلام ''شعلہ زار'' 1926 میں دہلی سے شائع ہوا۔ ''خم خانۂ جاوید جلد پنجم میں ان کا تذکرہ مع نمونۂ کلام موجود ہے۔ ان کی ادبی خدمات کے صلے میں دلی کلاسا ہتیہ پریشد نے ان کو 1980 کا ایوارڈ عطا کیا۔

دوارکا داس شعلہ ایک پرکشش شخصیت کے مالک تھے۔ اونچا درمیانہ قد، تندرست قامت، سرخی مائل گورا رنگ، ستواں ناک، پتلے ہونٹ، چمکتی ہوئی ذہانت آمیز آنکھیں، جسم پر قیمتی شیروانی، سفید چوڑی دار پاجامہ اور سر پر ہم رنگ دو پلی ٹوپی۔ چال باوقار، خوش مزاج وخوش گفتار اور چہرہ دلنواز۔ تو ایسے تھے ہمارے ہردلعزیز ادیب وشاعر لالہ دوارکا داس شعلہ۔

ہارون نگر سیکٹر 2، پھلواری شریف، پٹنہ
فون: 9123237633 ralinomani@gmail.com

لاہور خصوصاً بیسویں صدی کے اوائل میں علامہ اقبال، حفیظ جالندھری، مولانا تاجور اور عطر چند کپور کے اردو مرکز کے سبب زبان وادب کے ایک اہم مرکز میں تبدیل ہوگیا تھا۔ اور اسکے افق پر شعروادب کے روشن ستاروں کا جھرمٹ گویا کہکشاں کا منظر پیش کر رہا تھا۔ شعلہ کا ادبی ذوق اور شعراء نوازی کا شوق اسی فضا میں پروان چڑھا تھا جس کی آبیاری ملک کی گنگا جمنی ثقافت نے کی تھی۔ گرچہ شعلہ کی مادری زبان پنجابی تھی مگر شاعر اور ادیب وہ اردو کے تھے۔ اردو ان کی جان ہی نہیں ایمان بھی تھی۔ فرماتے ایک مجوبہ کے ہوتے ہوئے دوسری پر نظر ڈالنا آداب عشق کی توہین ہے۔ اردو شعلہ کو اس لئے پسند تھی کہ اردو والے انہیں پسند تھے۔ چنانچہ جب وہ نرائن داس بھگوان داس کمپنی لاہور کے مہتمم اعلیٰ اور دولت کثیر کے مالک تھے۔ انہوں نے بہت سارے ادباء وشعراء کی سرپرستی کی۔ لاہور میں ان کا گھر گویا مہمان خانہ بن گیا تھا۔ جوش، فراق، مجاز، جگر اور یگانہ جب کبھی لاہور وارد ہوتے عموماً شعلہ ہی کے مہمان ہوتے۔ ہجرت کے بعد لاہور کی وہ ادبی رونق بھی شعلہ کے ساتھ دہلی منتقل ہوگئی۔ اور وہ جوش سخن سے یہاں بھی برسوں بزم چراغاں کئے رہے۔

ان کی خوش خلقی اور وضعداری ایسی تھی جو مخصوص وغیر مخصوص کا امتیاز نہیں جانتی تھی۔ وہ غیر معروف ملاقاتیوں اور نئے مہمانوں کو بھی سر آنکھوں پر بٹھاتے اور دل میں جگہ دیتے۔ ایک مرتبہ ایک محقق مرزا یگانہ پر تحقیقی مواد کی جستجو میں دلی وارد ہوا اور شعلہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ نے اس کا نہایت گرمجوشی کے ساتھ استقبال کیا۔ اس کی تحقیقی ضروریات میں پورا تعاون فرمایا۔ مرزا کے پرانے احباب خصوصاً منور لکھنوی اور مالک رام سے ملایا۔ خود مرزا کے مختلف گوشہ حیات پر روشنی ڈالتے رہے۔ ہفتہ بھر گویا یہی معمول رہا۔ چنانچہ روانگی کے دن محقق جب شعلہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے اسکو دعائیں دیں۔ یگانہ سے متعلق تمام مطبوعہ سرمایہ اس کے حوالے کیا اور آخر میں پانچ سو روپئے اس کو پیش کئے۔ روپئے دیکھ کر محقق گھبرا سا گیا۔ حضرت یہ روپے کس لئے؟ اس نے حیرت کے ساتھ دریافت کیا۔ فرمایا، آپ مرزا کی خاطر دور دراز سے میرے پاس پہنچے۔ تو مہمان بھی میرے ہی ٹھہرے۔ اس ادنیٰ سی رقم کو میری میزبانی سمجھ کر قبول کریں۔ حضور یہ تو آپ کی عظمت ہے۔ ناچیز پر آپ کی عنایتیں کیا کم ہیں کہ مزید .... اور جملہ ادھورا چھوڑ کر محقق نے شکریہ اور معذرت کے ساتھ وہ رقم شعلہ صاحب کو واپس کر دی۔

شعلہ اتنے اچھے تھے کہ انکی نگاہ میں برا شاید کوئی نہ تھا۔ چنانچہ ان کی نظریں کانٹوں کو نہیں پھولوں کو ڈھونڈتی تھیں۔ ان کا جذبۂ قرابت وشرافت جب کبھی وجد میں آتا تو کسی کو اقلیم سخن کے تخت پر بھی بٹھا دیتا۔ ایسے ہی جذبات سے مغلوب ہوکر انہوں نے مرزا یگانہ اور پنڈت ہری چند اختر کے سر پر بادشاہ سخن کا تاج رکھ دیا تھا۔ ''میں نے اقلیم سخن کے صرف

دو بادشاہ مانے ہیں۔ میرزا یگانہ لکھنوی اور پنڈت ہری چند اختر۔'' (شعلہ زار)

بادہ نوشوں کی خوش اخلاقی کا ایک انداز یہ بھی ہے کہ وہ مہمانوں کو ساتھ بٹھا کر پلائے۔ اس سے پینے والے کو لطف، خواہ جس قدر بھی حاصل ہوتا ہو مگر پلانے والا تو مسرت کے سرور میں مدہوش ہوا جاتا ہے۔ شعلہ کے قدردان ایک پروفیسر صاحب بیان کرتے ہیں جب مجھے شعلہ صاحب کا نیاز حاصل ہوا، ان کے قویٰ مضمحل ہو چلے تھے۔ لیکن ہاتھوں میں جنبش اور آنکھوں میں دم باقی تھا۔ ساغر و مینا سے انکی شب و روز رغبت ایک گونہ بے خودی کی طالب تھی۔ ایک روز جب میں حاضر خدمت ہوا وہ بادہ و شیشہ سے شغل فرما رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی لہکتے ہوئے بولے۔ آؤ بھئی پروفیسر آ جاؤ! اور بھرا ہوا گلاس بڑھاتے ہوئے کہا۔ لو یہ جام جانفزا حاضر ہے۔ انکے اس طرز عمل سے میں پریشان ہو گیا۔ حضور! شکریہ مجھے معاف فرمائیں۔ شراب زندگی میں کبھی چکھی ہی نہیں۔ کیا ہوا جو نہیں چکھی۔ آج تو میری خاطر پی لو۔ عزیزم! تم شاعر نہیں صرف پروفیسر ہو۔ سن لو کہ اس محفل میں جوش و جگر اور مجاز کا کیا ذکر کہ وہ خم کے خم لنڈھانے والے تھے۔ اب اس کو مئے کا اعجاز سمجھو یا میرا کرشمہ کہ استاذ یا بولا اثر حفیظ صاحب کو میں نے ایک بار تو شیشے میں ضرور اتار لیا۔ پھر بھرا ہوا اپنا جام میرے گلاس سے ٹکرا دیا۔ اور ہم لوگ دعاؤں کے ساتھ باہم صحت کا جام پینے لگے۔

شعلہ صاحب بظاہر سنجیدہ تھے لیکن طبیعت انہوں نے شوخ پائی تھی۔ چنانچہ انکی شوخی طبع سے ماحول اکثر خوشگوار بن جاتا تھا۔ ایک مداح شعلہ فرماتے ہیں۔ ایک مرتبہ میں شعلہ صاحب کے ساتھ بیٹھا تھا کہ اندرون خانہ سے اچانک یہ آواز سنائی دی۔ اجی سنتے ہو! کب سے کہہ رہی ہوں کہ راکھ منگوا دو، ! سن رہا ہوں و دیا (بیگم کا نام) اب میری بھی سن لو کہ اگر ناچیز کو خاکسار کرنا منظور ہے تو میرے ایش ٹرے کی راکھ کافی ہے۔

مرزا یگانہ سے شعلہ کی یگانگت کی ابتدا لاہور میں ۱۹۲۶ء سے ہوئی۔ یگانہ سے انہوں نے کلام پر اصلاح بھی لی۔ مگر یگانہ نے شعلہ کو شاگرد نہیں، ہمیشہ دوست کہکر مخاطب کیا۔ ایسا دوست جو پریشان حالی میں دوست کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لے۔ مشکل وقت میں شعلہ کا آڑے آجانا اور انسانیت کا حق ادا کرنا تاریخ میں یادگار رہے گا۔ خدا شعلہ کو زندہ اور خوش رکھے کہ 1943 سے وہی میرا کفیل ہے۔ یہ رہا ایک ہندو کا برتاؤ ایک مسلمان کے ساتھ۔ آدمیآدمیانترکوئی ہیراکوئی کنکر!

شعلہ کو مرزا یگانہ سے کس قدر عشق تھا کہ وہ قبر یگانہ کی مٹی اپنے پاس رکھتے اور فرط عقیدت سے اسکو آنکھوں سے لگاتے اور بوسہ دیتے۔ شعلہ کی دلی تمنا تھی کہ مرزا کا مزار پختہ بن جائے۔ چنانچہ اس وقت کے وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد کو خط لکھ کر سرکاری سطح پر تعمیر مزار کی گزارش کی۔ مگر حضرت مولانا کی خاموشی نے شعلہ کا دل توڑ دیا۔ تاہم شعلہ اظہار رنجش کے بغیر کس طرح دل شکستہ کو تسکین دیتے ہیں۔ میرے میرزا کو زندگی میں زیب و زینت سے تعلق نہ رہا۔ شان و شوکت سے واسطہ نہ رہا، مرنے کے بعد قبر کی تزئین کیوں گوارا فرماتے۔

خوش مذاقی شرط ہو جس کے نظارے کے لئے
اس گل خود رو کو یارب زینت ویرانہ کر

ادب پروری کے طفیل کیسے کیسے یگانہ روزگار کی صحبت شعلہ کے حصے میں آئی۔ ادیب و شاعر پر اگر وہ لعل و گہر لٹاتے رہے تو انکی صحبتوں میں بیٹھکر علم و دانش کے آبدار موتی بھی چنتے رہے۔ باکمالوں کی محفل سے شعلہ کی شاعری کو جسقدر بھی فیض پہنچا ہو، مگر انکے مضامین تو کمال ہم نشینی سے مشکبار نظر آتے ہیں۔ چنانچہ معروف علمی و ادبی شخصیتوں کے مرقعے شعلہ کی نثر نگاری اور انشا پردازی کے امتیازی نشان ہیں۔ حفیظ جالندھری، یگانہ چنگیزی، قاضی عبدالودود، امتیاز علی خاں عرشی، جمیل مظہری، مالک رام اور مختار الدین احمد وغیرہ خصوصاً ایسے صاحبان علم و فضل ہیں، جن سے شعلہ کے مراسم مخلصانہ بھی تھے اور بے تکلفانہ بھی۔ اور جنکا نقش شعلہ کے دل و دماغ پر گہرا تھا۔ انکے مضامین تعلقات و تاثرات کی ایسی تصویریں ہیں جن میں ان شخصیتوں کی عظمت و فضیلت اور مخصوص صفت نمایاں ہیں۔ اور جہاں خود شعلہ ایک پیکر عجز و انکسار بنکر موجود رہتے ہیں۔

شعلہ مزاج کا بڑا رچا ہوا شعور رکھتے تھے۔ اسی لئے تازگی و شگفتگی ان کے اسلوب میں رچ بس گئی تھی۔ وہ الفاظ کی بجائے خیالات سے مزاح لطیف کا پہلو پیدا کرتے ہیں۔ ''سنتا ہوں میری پیدائش پر میرے بزرگ بہت خوش ہوئے۔ بدقسمتی سے خوش ہونے والے سارے بزرگ اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ورنہ میں پوچھتا کہ میں خوش نہیں آپ کیوں خوش تھے۔''

''دکان پر خالی شیشیاں دھونے کے لئے ملازم کی ضرورت تھی۔ والد نے سوچا لڑکا پڑھا لکھا ہے سلیقے سے کام کرے گا تو نام پیدا کرے گا۔''

''نہ جانے ایسا کیوں ہے کہ چائے پی کر عام طور پر اور کھانا کھا کر خاص طور پر لوگ ہر شعر کو سمجھنے لگتے ہیں۔ اکثر ایسا ہوا کہ مشاعرہ میں دس شعر میں نے پڑھے، داد ایک پر بھی نہ ملی۔ اور وہی شعر چائے پلا کر یا کھانا کھلا کر سنائے تو ہر شعر پر بے ساختہ داد پائی۔''

دوارکا داس مخلص کی حد تک شعلہ ضرور تھے مگر ان کی شخصیت شعلہ ساماں نہیں شبنم آسا تھی۔ اسمیں وہی..... ٹھنڈک تھی جو گلاب پر.... صبح کی شبنم میں ہوتی ہے۔ شعلہ زار کے کلام میں وہ شعلگی نہیں جو خون کو گرما دے۔ لیکن وہ دل گرفتگی ضرور ہے جو دلوں کو تڑپا دے۔ ان کے یہاں عموماً اس ٹھہرے ہوئے سکون کا احساس ہوتا ہے جو جذبات پر کامل عبور اور ضبط و نظم کا نتیجہ ہوتا ہے۔ البتہ یگانہ کے اثر سے اس میں جگہ جگہ فکر و دانش کی چنگاریوں کا ایسا منظر ضرور نمایاں ہوتا ہے جیسا شب تاریک میں رقص شرر سے پیدا ہوتا ہے۔

تلاش حق میں نہ دینا کو چھوڑ اے غافل
کہیں کا بھی نہ رہے گا اگر خدا نہ ملا

آگہی کم ہے گمراہی کم ہے — کچھ نہ کچھ بار زندگی کم ہے
آنکھوں میں وہ نمی نہیں باقی — اور کچھ دل میں درد بھی کم ہے

1966 میں نرائن داس اینڈ کمپنی کا خاتمہ ہو گیا۔ اور اسی کے ساتھ شعلہ کی مالی حالت سقیم سے سقیم تر ہوتی چلی گئی۔ عہد فروزاں میں شعلہ کی زندگی جس عیش و مسرت کے ساتھ گزری تھی، اب سخت آزمائشوں سے دوچار تھی۔ ادبار کی گھٹا ایسی چھائی کہ دیکھتے دیکھتے ان کی حالت کیا سے کیا ہو گئی۔

نہ جانے کون سے غم نے کیا یہ حال شعلہ کا
کہ بے چارے کی صورت بھی تو پہچانی نہیں جاتی

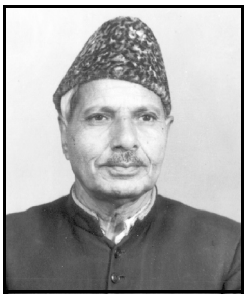
مالک رام کے لفظوں میں ''شعلہ کے پرانے ملنے جلنے والے اگر ان کے آخری ایام کی حالت دیکھتے تو انہیں نہ صرف دکھ ہوتا بلکہ عبرت بھی ہوتی۔'' پھر وقت نے سب سے بڑا ستم یہ ڈھایا کہ 1981 میں شریک حیات و دیا بھی داغ مفارقت دے گئی۔ اور وہ دنیا میں یک و تنہا ہو گئے۔ چنانچہ دلی میں بیٹی کا گھر باپ کی زندگی کا آخر پڑاؤ بن گیا۔

دوارکا داس کی ذات سے اعلیٰ انسانی اقدار کی جو شمع روشن تھی، آخرش وہ خاموش ہو گئی۔ وہ شعلہ تاباں جو مقصود ہر پروانہ تھا، 10 اپریل 1983 کی سحر سے پہلے بجھ گیا۔ جہاں سے وہ کیا اٹھے، رواداری و دلداری کی رسمیں بھی گویا اٹھ گئیں۔ افسوس! وہ دھوپ آفتاب کے ساتھ رخصت ہو گئی۔

☆☆

مقبول واجد





روایت در روایت کا شاعر: شعریؔ بھوپالی

بزمِ تخلیق میں مسجودِ ملائک میں تھا
حشر تک پھر کوئی سجدہ نہ ہوا میرے بعد

بھوپال صدیوں سے علم وادب کا گہوارہ رہا ہے۔ یہ شہر جہاں خوبصورت قدرتی مناظر، جھیلوں، تالابوں اور مسجدوں کے لئے مشہور رہا ہے وہیں اِس شہر کے مایہ ناز عالمگیر شہرت کے مالک ہاکی اور کرکیٹ کے کھلاڑیوں نے بھی اِس کی شہرت اور مقبولیت میں چار چاند لگائے ہیں۔ وہیں ادب کے میدان میں بھی بھوپال برِصغیر میں نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ سراج میر خاں سحرؔ، ذکی وارثی، سہا مجدّدی، ملّا رموزی، شعریؔ بھوپالی، وکیلؔ بھوپالی، تخلّص بھوپالی، کیفؔ بھوپالی، اسدؔ بھوپالی، تاجؔ بھوپالی، فضل تابشؔ، اختر سعید خاں وغیرہ کے نام سے بھلا کون واقف نہیں۔ ان حضرات کی ادبی کاوشوں اور ذہنی وسعتوں سے نہ صرف بھوپال کا نام روشن ہوا ہے بلکہ ادبی دنیا بھی مالا مال ہوئی ہے۔ اِسی بھوپال کی مردم خیز سرزمین نے ایک ایسے ہونہار پٹھان شاعر کو پروان چڑھایا جو ایک دو نہیں پوری سات دہائی تک اردو ادب کے اُفق پر آفتاب و ماہتاب بن کر چھایا رہا۔ جس کی غزل گوئی کو نظر انداز کر کے اردو غزل کی تاریخ مکمل نہیں کی جاسکتی۔ میری مراد روایت در روایت کے شاعر آبروئے غزل حضرت شعریؔ بھوپالی مرحوم سے ہے۔ بھوپال کا یہ مایہ ناز فرزند جو اپنے کمالِ شاعری کی وجہ سے ہندوستان کے ہر سخن فہم کے دل و دماغ پر ستّر سال تک حکمرانی کرتا رہا، اپنے حسب نسب کے اعتبار سے سیستان کے ایک فرماں روا خاندان کا فرد تھا۔ ''شعلۂ حیات'' میں مرحوم ایم عرفان اُن کے متعلق لکھتے ہیں:

''خاندانی اعتبار سے مولانا اصغر شعریؔ کے دادا مولوی محمد عرفان خاں حاکمِ سیستان کے حقیقی بھائی تھے جو گھریلو جھگڑے کے باعث اپنی جان بچا کر ہندوستان جنّت نشان میں وارد ہوئے اور بھوپال میں عہدِ شاہجہانی کی علم دوستی کا چرچا سُن کر بھوپال پہنچے۔ نواب صدیق حسن خاں کے مقرّب اور فارسی کے مدرّس مقرّر رہوئے۔ دادا مرحوم کے بعد شعریؔ بھوپالی کے والد مولوی محمد اکبر خاں فارسی کے منتہی اور ''مدرسہ سلیمانیہ'' میں مدرّس ہوئے۔''

شعریؔ بھوپالی 1914 میں صوبۂ اتر پردیش کے تاریخی شہر آگرہ کے قصبہ اکبر آباد میں پیدا ہوئے۔ لیکن پیدائش کے چند ماہ بعد ہی ان کی والدہ اپنی سسرال بھوپال آ گئیں اور پھر شعریؔ بھوپالی یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ پرورش سے لے کر تعلیم و تربیت تک سب کچھ بھوپال میں ہی ہوئی اور آخری سانس تک بھوپال ہی ان کا وطن رہا۔ شعریؔ بھوپالی اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھے۔ ظاہر ہے کہ ان کی پرورش نہایت ناز و نعم سے ہوئی ہوگی۔ کہتے ہیں کہ ''پوت کے پاؤں پالنے میں ہی نظر آتے ہیں''، بچپن سے ہی شعریؔ بڑے ذہین تھے۔ عام دستور کے مطابق ان کی تعلیم کا آغاز بھی بسم اللہ سے ہوا اور اس طرح انھوں نے بہت کم عمری میں قرآن شریف پڑھ لیا۔ ان کے زمانے میں جدید تعلیم کی سہولتیں عام نہیں تھیں۔ لہٰذا اُن کی تعلیم بھی عربی، فارسی اور اردو تک ہی محدود رہی۔ طالب علمی کے زمانے سے ہی انھیں شاعری کا بھی شوق ہو گیا۔ اردو، فارسی کی تعلیم سے فارغ ہو کر 1936 میں طب کی باقاعدہ تعلیم حاصل کرنے کے لئے طبیہ کالج دہلی میں داخلہ لیا اور مسلسل تین سال تک دہلی میں مقیم رہ کر طب کی تعلیم حاصل کرتے رہے لیکن انھوں نے علم طبّ کی تکمیل ''دیش بھگت کالج'' آگرہ سے کی۔ 1939 کے دوران شعریؔ صاحب بھوپال کی سیاست میں بھی سرگرم رہے۔ انھوں نے دو بار میونسپل بورڈ کا الیکشن بھی لڑا اور دونوں بار ہی کامیاب رہے۔ کچھ دنوں تک آپ نے محکمۂ پولس میں بھی ملازمت کی مگر جلد ہی نوکری چھوڑ دی اور پھر کچھ دنوں بعد محکمۂ زراعت میں ڈیمانسٹریٹر کی ملازمت اختیار کر لی اور اسی سے سبکدوش ہوئے۔

حضرت شعریؔ بھوپالی ۱۱ سال کی کم سنی کی عمر سے ہی شعر کہنے لگے تھے۔ ابتداء میں اصغرؔ تخلص کرتے تھے لیکن وہ زمانہ حضرت اصغرؔ گونڈوی مرحوم کا تھا لہٰذا شعریؔ صاحب کی جو بھی غزل مشہور ہوتی تھی وہ اصغرؔ گونڈوی کے نام موسوم ہو جاتی تھی۔ لہٰذا اُن کے استادِ محترم حضرت ملّا رموزی (بانی گلابی اردو) نے ان کا تخلص شعریؔ کر دیا۔ شروع شروع میں آپ مائلؔ دہلوی اور ذکی وارثی سے اصلاح لیتے تھے اور بعد میں حضرت ملّا رموزی سے اصلاح لینے لگے۔ ڈاکٹر سلیم حامد رضوی اپنی تحقیقی کتاب ''اردو ادب کی ترقّی میں بھوپال کا حصّہ'' میں فرماتے ہیں:

> ''شعریؔ بھوپالی جگرؔ اسکول کے شاعر ہیں۔ کلام رعنائی خیال اور حسنِ بیان کا حسین مجموعہ ہے جس کا والہانہ انداز اور بے پناہ ترنّم جادو کا اثر رکھتا ہے۔ جس مشاعرہ میں چلے جاتے ہیں وہاں بڑے بڑے استادوں کی شمعیں بجھتی ہوئی معلوم ہونے لگتی ہیں۔ جگرؔ مرحوم کی طرح ان کے یہاں دعوتِ فکر کم اور دعوتِ احساس زیادہ ہے۔ جذبات کی سرمستی و رنگینی بیان کی صفائی الفاظ کا حُسن اور کلام کا ترنّم سامع کو تھوڑی دیر کے لئے فردوسِ گوش کی ایک ایسی وادی میں پہنچا دیتا ہے جہاں شعر و نغمہ کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔''

ان کی ملک گیر شہرت کی بنیاد دہلی میں پڑی۔ جہاں ایک بار شفاخانہ یونانی کی طرف سے ادویات کی خریداری کے لئے بھیجے گئے تھے۔ رات کو طرحی مشاعرہ ہونے والا تھا۔ نظر پوسٹر پر پڑی تو ہوٹل میں بیٹھے بیٹھے ہی غزل کہہ ڈالی۔ مشاعرہ میں غزل پڑھنے کی اجازت بڑی مشکل سے ملی۔ لیکن جب ملی تو کلام کی خوبی اور پڑھنے کے انداز نے مل کر مشاعرہ لوٹ لیا۔ اس کے بعد تو شعریؔ بھوپالی اس درجہ مشہور ہوئے کہ تمام آل انڈیا مشاعروں میں بطور مہمانِ خصوصی بُلائے جانے لگے۔

ایسا ہی کچھ بھوپال میں منعقد ہونے والے آل انڈیا مشاعرہ میں بھی ہوا۔ 1940 میں ایک طرحی مشاعرہ ہوا جس میں جگرؔ مرادآبادی، حفیظؔ جالندھری، احسنؔ مارہروی، احسان دانشؔ، فراقؔ گورکھپوری، سراجؔ لکھنوی اور شوکتؔ تھانوی شریک تھے۔ اس مشاعرے کا ایک شعر بھی کسی کو یاد نہیں ہوگا مگر شعریؔ کی غزل نے نہ صرف مشاعرہ لوٹ لیا بلکہ تمام ہندوستان میں مشہور ہوگئی۔

4۔ آم والی مسجد روڈ، جہانگیر آباد، بھوپال۔462008
فون: 9425377323 maqboolwajid@gmail.com

اس کے ریکارڈ بھی بنے اور فلم میں بھی گائی گئی۔

اگر کچھ تھی تو بس یہ تھی تمنّا آخری اپنی
کہ وہ ساحل پہ ہوتے اور کشتی ڈوبتی اپنی

اسی طرح 1941 کے آل انڈیا مشاعرہ میں جوشؔ، فانیؔ، جگرؔ، حفیظؔ اور سیمابؔ اکبرآبادی وغیرہ کی موجودگی میں غزل پڑھ کر مشاعرہ میں اپنا سکّہ جما دیا، مطلع تھا۔

حریفِ جلوۂ جاناں مرا دل ہوتا جاتا ہے
شکستیں کھاتا جاتا ہے، مقابل ہوتا جاتا ہے

یوں تو شعریؔ بھوپالی نے سبھی اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ لیکن بنیادی طور پر وہ غزل کے شاعر تھے۔ اگر جگرؔ اور شعریؔ کو ایک ساتھ رکھا جائے تو ایک اجنبی شخص کے لئے یہ طے کرپانا بڑا دشوار ہوگا کہ کون سی غزل جگرؔ کی ہے اور کون سی شعریؔ کی۔ دونوں نے غزل کے ایک محدود دائرے میں رہ کر غزل کے میدان میں بڑی وسعت اور جامعیت پیدا کی ہے۔ فریادِ وطن اور شاعر کا پیغام، ان کی نظموں کا مجموعہ ہے۔ غزل کا پہلا مجموعہ 'صبحِ غزل' 1964 میں دہلی سے شائع ہوا اور پھر دوسرا ایڈیشن پاکستان میں اکتوبر 2004 میں بہت اعلیٰ پیمانے پر شائع کیا ہے۔ پھر اس کے ایک مدّت کے بعد غزل کا دوسرا مجموعہ 'آتشِ دل' 1984 میں اردو اکادمی مدھیہ پردیش کے جزوی مالی تعاون سے شائع ہوا۔ راقم الحروف نے ان کے دو مجموعۂ کلام 'فردوسِ غزل' اور 'آہنگ' اُن کی زندگی میں ہی ترتیب دئے تھے جو کسی وجہ سے اُن کی زندگی میں شائع نہ ہوسکے۔ اس کے علاوہ دیوناگری رسم الخط میں ان کی چیندہ غزلوں کا مجموعہ 'پریم ساگر' بھی ان کی زندگی میں ہی ترتیب دیا تھا مگر افسوس کہ یہ بھی کچھ خاص وجوہات کی بناء پر اب تک منظرِ عام پر نہیں آسکا ہے۔

1935 میں دہلی کے ایک طرحی مشاعرہ میں ان کو ''حامد علی خاں گولڈ میڈل'' سے سرفراز کیا گیا۔ 1939 میں ''طبیہ کالج میڈل'' اور 1959 میں میونسپل کارپوریشن بھوپال کی جانب سے اعزاز دیا گیا۔ 1967 میں بھوپال کی عوام نے اپنے اس ہردلعزیز شاعر کو ''تاج الشعراء'' کا خطاب عطا کیا۔ پھر 1980 میں مدھیہ پردیش اردو اکادمی، بھوپال کی جانب سے ''سراج میر خاں سحرؔ'' ایوارڈ سے نوازا گیا۔ اِسی طرح 1987 میں انھیں ''مدھوبن'' ایوارڈ سے بھی سرفراز کیا گیا۔ ان انعامات واعزازات کے علاوہ ان کی ادبی خدمات کو مدّنظر رکھتے ہوئے مدھیہ پردیش لنگویج ڈپارٹمنٹ کی جانب سے اُنہیں پانچ سو روپیہ ماہانہ ادبی پنشن بھی جاری کی گئی تھی جو تاحیات ان کو ملتی رہی، ساتھ ہی ساتھ ایک سرکاری مکان بھی انہیں رہائش کے لئے مِلا تھا۔

شعریؔ بھوپالی کے زمانے میں بھوپال میں فنِ چاربیت عروج پر تھا۔ لہٰذا دوستوں کے اسرار پر انھوں نے ہزاروں چاربیتیں لکھیں اور اس میدان میں بھی خوب نام کمایا۔ مگر انھوں نے اس فن کو شاعری تسلیم نہ کرتے ہوئے اُسے اپنے ادبی سرمائے میں شامل نہیں کیا۔ فی البدیہہ چار بیتیں کہیں اور چاہنے والوں کے حوالے کردیا اور یہ چاربیتیں انھیں چاہنے والوں کے نام منسوب بھی ہوگئیں۔ چاربیت کے ساتھ ساتھ اُن دنوں بھوپال میں قوّالی کا بھی بڑا بول بالا تھا۔ شادی بیاہ، ہولی، دسہرہ اور عرس وغیرہ کے موقعوں پر ہندوستان، پاکستان کے معروف قوّال بھوپال آتے اور اپنے فن کا مظاہرہ کیا کرتے تھے۔ شوقیہ طور پر مقابلی قوّالیاں بھی اکثر ہوا کرتی تھیں۔ لہٰذا بھوپال میں بھی قوّالوں کا جمگھٹ ہوا کرتا تھا۔ ظاہر تھا کہ دوستوں اور قوّالوں نے قوّالی کے مکھڑے اور کبھی کبھی پوری قوّالیاں لکھنے کے لئے بھی انہیں مجبور کیا ہوگا۔ اس طرح انھوں نے کئی مشہور قوّالیاں بھی لکھیں اور قوّالیوں کے مکھڑے بھی۔ قوّالہ شکیلہ بانو بھوپالی تو شعریؔ صاحب اور ان کے کلام سے کچھ زیادہ ہی متاثر تھیں۔ ان کی فرمائش پر انھوں نے بالخصوص شکیلہ کے لئے کئی مشہور قوّالیاں لکھیں اور کچھ قوّالیاں تو انھیں کے نام سے منسوب بھی کردیں۔ شعریؔ بھوپالی کی مشہور غزل ''تصوّر سے دل وجاں کو اُجالا کرلیا میں نے'' اور:

پوچھو نہ ہمیں عشق میں کیا کیا نظر آیا
اللہ کی قدرت کا تماشا نظر آیا

شکیلہ بانو کی فلمی قوّالیوں میں شامل ہیں اور ان کے گراموفون ریکارڈ بھی بنے اور خوب بِکے بھی۔ اسی طرح ہندوپاک کے سبھی مشہور گلوکاروں نے شعریؔ بھوپالی کی بے شمار غزلوں کو اپنی آواز کے جادو سے جگایا۔ جس میں مہدی حسن، رانو مکھرجی، بھوپندر سنگھ، جگجیت سنگھ، چترا سنگھ اور متالی خاص ہیں۔ حضرت شعریؔ بھوپالی نے فلموں کے لئے بھی غزلیں اور قوّالیاں لکھیں۔ فلم ''جگنو'' (دلیپ کمار، نور جہاں) میں نور جہاں کی آواز میں گائی ہوئی غزل:

ہمیں تو شامِ غم میں کاٹنی ہے زندگی اپنی
جہاں وہ ہوں وہیں اے چاند لے جا چاندنی اپنی

.....کا ریکارڈ آج بھی ہمیشہ جواں گیتوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ مگر کبھی بھی انھوں نے فلموں کو اپنا پیشہ نہیں بنایا، یہی وجہ ہے کہ 'آخری پیغام' اور 'کیپٹن آزاد'، 'ہنٹر والی' جیسی کچھ فلموں کے بعد انھوں نے اِس لائن کو ہمیشہ ہمشہ کے لئے ترک کردیا اور تاحیات خالص اردو غزل کی نوک پلک سنوارنے میں ہی فخر محسوس کرتے رہے۔ یوں تو شعریؔ بھوپالی خالص غزل کے شاعر تھے مگر انھوں نے نہ صرف عاشقانہ مضامین غزل میں باندھے ہیں بلکہ تصوّف اور اخلاقی وفلسفیانہ مضامین بھی سموئے ہیں۔ شعریؔ کو جو چیز دوسرے ہم عصر شعراء سے منفرد کرتی ہے وہ ہے ان کا رنگِ تغزّل۔ اس رنگ کو انھوں نے کبھی بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا بلکہ اس میں رنگین جدّتیں بھی پیدا کی ہیں۔ ان کی غزلوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا محبوب مذکّر نہیں مؤنث ہے۔ وہ انھیں کی طرح ہمارے سماج کا ایک فرد ہے کسی دوسری دنیا کا باشندہ نہیں۔ شعریؔ کی غزلیں پڑھنے کے بعد آپ بیساختہ کہہ اُٹھیں گے کہ مومنؔ اور جرأتؔ کا رنگ ایک نئے لباس میں شعریؔ کے یہاں جلوہ گر ہوا ہے۔ شعریؔ کی غزلیں اردو غزل میں وہ اضافہ ہیں جس کا اصغرؔ، فانیؔ اور جگرؔ کو چھوڑ کر شاید ہی کوئی مقابلہ کرسکے۔ فانیؔ کا حزن وملال شعریؔ کے یہاں تو نہیں ملتا مگر اصغرؔ کا نشاطِ بودگی وکیف شعریؔ کے یہاں بدرجہ اتم موجود ہے۔ جگرؔ کی لذّت پرستی اور والہانہ سرمستی شعریؔ کے یہاں خاصی پائی جاتی ہے۔ مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی جھجک نہیں کہ شعریؔ کے یہاں موجود عشق اور اس کی کیفیات ان کے معاصرین کے یہاں نہیں ملتیں۔ شعریؔ کی شاعری جمالیاتی کیفیتوں اور عشق کی وارداتوں کی ترجمان ہے اور یہی حسن وعشق ان کی شاعری کی روح ہے جو عشق کا ایک بلند اور پاکیزہ تصوّر پیش کرتی ہے۔ ان کا عشق بازاری نہیں بلکہ معیاری ہے جہاں محبت کی میٹھی میٹھی باتیں اور پریم ساگر میں ڈوبے ہوئے اشارے اور کنائے ہیں۔ شعریؔ اپنی غزلوں میں ان جذبات کو بھی جگہ دیتے ہیں جو اُس دور کے رئیس زادوں، جاگیرداروں اور عیّاش طبقے کے ساتھ وابستہ تھیں۔ عشق ومحبت کا ایک ایسا پاکیزہ جذبہ ہمیں عربی شاعری کے علاوہ کہیں اور نہیں ملتا۔ غالباً عشق کا یہ پاکیزہ تصوّر ہی اس بات کا ذمّے دار ہے کہ شعریؔ کی غزلوں میں رقیب کا ذکر بالکل نہ ہونے کے برابر ہے۔ شعریؔ کا عشق مجازی ہے اور جہاں کہیں انھوں نے کوئی دوسرا پہلو بدلا ہے وہ بھی عشق مجازی کا ہی ردِّعمل معلوم ہوتا ہے۔ شعریؔ کا تصوّر، انتظار، ہجر، فرقت، نامہ وپیام کوچۂ یار تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ وہ محبوب کے ناز وانداز سے لے کر محبوب کے جبر واستبداد تک پھیلا ہوا ہے۔ انھیں ہر چیز حسین نظر آتی ہے اور یہ ان کا اپنا آدرش ہے جس سے انھیں فطری لگاؤ ہے:

جنت ملی، بہار ملی، زندگی ملی
سب مل گئے جو اُن سے ملاقات ہوگئی

شعریؔ کی غزلیں افادیت کی حدوں کو چھوتی ہیں، جہاں آرٹ میں یہ قدرت پیدا ہوجاتی ہے کہ انسان اُس افسردگی کو زائل کردے جو اسبابِ معیشت کی جستجو، محصولِ زر کی تمنّا، ترقّی اور نام ونمود کی ہوس ان پر چھائی رہتی ہے:

قفس میں جان دے دینا اُس آزادی سے بہتر ہے
قریب آشیاں بیٹھا رہوں بے بال و پر ہوکر

شعریؔ نہ تو فلسفی ہیں اور نہ ہی فلسفیانہ گتھیاں سُلجھانے کے درپہ ہوتے ہیں، نہ کوئی بات راز میں رکھتے ہیں اور نہ ہی پُر اسرار بننے کی کوشش ہی کرتے ہیں۔ ان کے سوچنے اور سمجھنے کا ڈھنگ ایک سیدھے سادے انسان کے موافق ہے جس کا دل جذبات سے لبریز ہے اور جب وہ تراوش کرتے ہیں تو ان میں تکلّف، تصنّع اور بناوٹ کا مطلق دخل نہیں ہوتا ہے۔ ان کے پیرایۂ بیان میں ایک فطری حسن اور دلکشی ہے:

حقیقت میں وہ میکدہ میکدہ ہے
جہاں بے پیے ہی قدم لڑکھڑائے

شعریؔ نے غزل کے معنوی رنگ میں ہی نکھار پیدا نہیں کیا ہے بلکہ غزل کی زبان میں بھی ایک مٹھاس پیدا کی ہے۔ انھیں زبان پر بڑا عبور حاصل ہے۔ وہ اپنے خیالات و جذبات جن الفاظ اور فقروں میں ادا کرتے ہیں وہ اس قدر بھرپور اور دلکش ہوتے ہیں کہ قاری یہ محسوس کرنے لگتا ہے ''میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے'' اس طرح کا اندازِ بیان کبھی کبھی لکھنؤ اسکول کے اسلوبِ شاعری کو بھی چھُو جاتا ہے پھر بھی زبان کا حسن اور سلیقہ ان کے بھرم اور وقار کو ٹھیس نہیں لگنے دیتا ہے:

ہاں پھر اُسی انداز سے دُزدیدہ نگاہیں ہاں پھر اُسی تیور سے نشانے پہ نشانہ

ان مست نگاہوں کی اللہ رے رعنائی فردوس میں حوریں بھی لینے لگیں انگڑائی

اردو شاعری میں اور خصوصیت سے غزل میں تصوّف کا عمل و دخل طرح طرح سے ہوتا رہتا ہے۔ شعریؔ کے یہاں بھی تصوّف کی چاشنی موجود ہے:

اے اسیرِ تصوّرات بتا کون اب کس کی بارگاہ میں ہے

کہہ دو اجل سے آئے نہ اب میری راہ میں میں مِل گیا ہوں سلسلۂ لا الٰہ سے

شعریؔ بھوپالی اسلوبِ شاعری کے اچھوتے پَن اور بے لوث خدمات کی بدولت نسل در نسل یاد رکھے جائیں گے۔ ان کی شاعری کا کلاسیکی اور رومانی پہلو ایک درخشاں ستارہ کی طرح اپنی شعاعوں سے روشنی بکھیر رہا ہے اور آنے والی نسلیں ان کے اس ادبی سرمائے سے اپنی سمت کا تعین کریں گی:

بھٹکیں نہ مرے بعد کے آئے ہوئے راہی
ہر موڑ پہ منزل کا نشاں چھوڑ دیا ہے

77 سال کی لمبی عمر کے باوجود انتقال سے محض ایک روز قبل جے پرکاش نرائن اسپتال بھوپال کے اسپیشل وارڈ میں پلنگ پر لیٹے لیٹے ہی انھوں نے مجھے ایک انیّس اشعار کی طویل غزل اور چند قطعات لکھوائے۔ تب کہیں سے ایسا نہیں لگ رہا تھا کہ یہ ان کی زندگی کی آخری غزل ہوگی اور پھر معمولی علالت کے بعد 9 جولائی 1991 کو آبروئے غزل حضرت شعریؔ بھوپالی جن کی آواز کبھی برّصغیر کے مشاعروں کی جان ہوا کرتی تھی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگئی اور ان کے آبائی مکان نزد یک کوتوالی سے جب ان کا جنازہ اُٹھا تو پورے بھوپال کی آنکھیں نم ہوگئیں۔ جنازہ کی نماز کلثوم بی صاحبہ کی مسجد کے سامنے ادا کی گئی اور تھوڑی دیر کے لئے جنازہ اقبال میدان (جس میں حضرت شعریؔ بھوپالی کبھی غزل سَرا ہوا کرتے تھے) عوام کی آخری زیارت کے لئے رکھا گیا۔ بھوپال کے ہر مذہب و ملّت کے لوگ منتری سے سنتری تک، اخبار، ریڈیو اور ٹی وی کے نمائندوں کے ساتھ ساتھ شعراء و ادباء، عوام و خواص اور ادب دوست و احباب نے جنازہ کو کاندھا دے کر اپنے محبوب اور ہر دلعزیز شاعر کو الوداع کہا۔ پھر ان کی آخری وصیت کے مطابق ہی بڑے باغ قبرستان میں مسجد کے زیرِ سایہ انہیں سپردِ خاک کر دیا گیا۔ آج بھی جب ان کی قبر پر فاتحہ خوانی کے لئے میرا جانا ہوتا ہے تو قبر پر لگے کتبہ:

اب نہ جاگے گا حشر تک شعریؔ
مدّتوں بعد نیند آئی ہے

دیکھ کر بیساختہ زبان پر انھیں کا شعر پھڑکنے لگتا ہے:

منظر و افسانہ، مرگ و زیست دو رُخ ہیں مرے
پہلے دیکھا جا رہا تھا، اب سُنا جاتا ہوں میں

شعریؔ صاحب کی وفات کے بعد اُن کے نام کو زندہ و پائندہ رکھنے کی غرض سے سرزمینِ بھوپال میں کچھ ادیبوں، شاعروں، دانشوروں اور اُن کے پرستاروں کے مشورہ سے ایک ادبی تنظیم شعریؔ اکادمی کا قیام عمل میں آیا۔ شعریؔ اکادمی ایک خالص ادبی، سماجی و ثقافتی تنظیم ہے جو اردو اور ہندی دونوں زبانوں کی ترقّی و ترویج کے لئے ہر وقت کوشاں رہتی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ملک کی سالمیت، ہندو مسلم یکجہتی، قومی بھائی چارگی اور گنگا جمنی تہذیب کو ہر قیمت پر برقرار رکھنے کی غرض سے ہر سال بھوپال میں ایک آل انڈیا مشاعرہ کا بھی پابندی سے اہتمام کرتی آرہی ہے۔ اس کے علاوہ ماہانہ شعری نشستیں بھی منعقد کرتی ہے۔

اکادمی نے حضرت شعریؔ بھوپالی مرحوم کے نام پر ایک ''شعریؔ بھوپالی ایوارڈ'' بھی جاری کیا ہے جو ابھی تک ملک کے نامور شعراء جیسے جناب قیصر الجعفری صاحب، پدم شری ڈاکٹر بشیر بدرؔ، پدم شری بیکلؔ اتساہی، ابراہیم اشکؔ، ڈاکٹر ماجد جائسی، راحیند رانوراگی، رضا رامپوری، منظرؔ بھوپالی اور ڈاکٹر عکسؔ وارثی کُشی نگری کو دیا جاچکا ہے۔

شعریؔ اکادمی کا اپنا ایک اشاعتی شعبہ بھی ہے جس کے تحت ملک کے نامور شعراء و ادباء کے شعری مجموعات اور نثری کتابیں جن کی تعداد دو سو سے بھی زیادہ ہیں شائع ہو چکی ہیں۔ ہنوز ابھی بھی یہ سلسلہ بدستور جاری ہے۔ اِسی طرح اکادمی کا ایک ادبی جریدہ سہ ماہی ''رسالۂ انسانیت'' بھی گزشتہ 12 برسوں سے دیوناگری رسم الخط میں شائع ہو رہا ہے جس کے نمائندے ملک اور بیرونِ ملک میں پھیلے ہوئے ہیں۔ آج سے ۶۔۷ برس قبل شعریؔ اکادمی کی پہل پر ہی دوردرشن دہلی نے شعریؔ بھوپالی کی شخصیت و فن پر ایک ڈیکومنٹری فلم بھی بنائی اور متعدد بار اُسے ٹیلی کاسٹ بھی کیا۔

شعریؔ اکادمی ایک لمبے عرصے سے اِس جدّ و جہد میں بھی رہی کہ بھوپال میں اُن کی یادگار کو قائم کرنے کے لئے اُن کی پرانی رہائش نزد سٹی کوتوالی روڈ کو اُن کے نام سے موسوم کر دیا جائے۔ سیاسی رہنماؤں کے بار بار وعدہ کرنے کے باوجود بھی یہ کام پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچ سکا۔ ماہ اگست 2013 میں شعریؔ بھوپالی کا سالانہ جلسہ منعقد کیا گیا جس کی صدارت پروفیسر سعید اختر صاحب فرما رہے تھے اور مہمانِ خصوصی سیاسی رہنما اب ایم.ایل.اے. جناب عارف مسعود صاحب اور جناب عزیز الدین صاحب (پارشد و زونل صدر) تھے اُن کی موجودگی میں اکادمی کے ہی جوائنٹ سکریٹری محمد عزیز خان نے ایک جامع پرچہ (اغراض و مقاصد، شعریؔ اکادمی) پڑھا جس میں سڑک کی نامزدگی کی بھی یاددہانی کی گئی، جس کو دونوں ہی سیاسی رہنماؤں نے سنجیدگی سے لیا اور باہمی مشورہ کے بعد عزیز الدین صاحب نے اپنے خطاب میں اِس بات کا اعلان کیا کہ میونسپل کارپوریشن کی آئندہ میٹنگ میں پُر زور طریقہ سے اِس بات کو رکھا جائے گا اور خوشی کی بات ہے کہ شعریؔ بھوپالی صاحب کی وفات کے 23 برس بعد 2014 میں عزیز الدین پارشد کی پہل پر نگر نگم بھوپال نے مسجد برجیسیہ سے چار بتّی چوراہا، بدھوارہ کو آنے جانے والی سڑک کو ''حضرت شعریؔ بھوپالی روڈ'' کے نام سے موسوم کرنے کا فیصلہ لیا۔

ایک لمبے عرصے سے شعراء، ادباء اور شائقینِ غزل کی یہ خواہش رہی ہے کہ شعریؔ صاحب کا غیر مطبوعہ کلام کتابی شکل میں شائع کیا جائے۔ ملک اور بیرونِ ملک کی اہم ادبی شخصیات جب بھی بھوپال آتی ہیں تو اُن کی دلی خواہش رہتی ہے کہ وہ اپنے محبوب شاعر حضرت شعریؔ بھوپالی صاحب کے کلام سے مستفید ہوں کیونکہ ان کے دونوں مجموعے اب کمیاب ہو چکے ہیں۔ لہٰذا بھوپال کے دانشوروں اور حضرت شعریؔ بھوپالی صاحب کی صاحبزادی محترمہ مختار بیگم سے مشورہ کر کے شعریؔ صاحب کی غیر مطبوعہ غزلوں کا ایک مجموعہ ''فردوسِ غزل'' شائع کیا گیا۔ ☆☆

محمد نوشاد عالم ندوی



شانتی رنجن بھٹاچاریہ کی ادبی و علمی خدمات

افسانوں کے حوالے سے



شانتی رنجن بھٹاچاریہ نے اپنی ادبی زندگی کی شروعات شعر گوئی سے کی، مگر بہت جلد افسانہ نگاری کی طرف متوجہ ہوگئے۔ بنگال کے اردو ادب میں ان کا نام کئی زاویوں سے اہم ہے، وہ بیک وقت اعلیٰ درجے کے مترجم، افسانہ نگار، محقق اور نقاد ہیں۔ وہ گوناگوں صفات کے حامل تھے، ان کے تجربات نہایت ہی متنوع اور وسیع ہیں۔ ان کی مادری زبان بنگلہ تھی، اس کے باوجود انہوں نے اردو زبان و ادب کی جو آبیاری کی ہے وہ لائق ستائش ہے۔ وہ زود نویس تھے، انہوں نے بہت ساری کتابوں کے علاوہ بہت سارے مضامین بھی تحریر کیے جو مختلف اخبار و جرائد میں شائع ہوتے رہے۔ سماجی خدمت کا جذبہ ان کے اندر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا، غریب بچوں کی مدد کرنا وہ اپنا اولین فرض سمجھتے تھے، اس کے علاوہ انہوں نے سیاست میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

شانتی رنجن بھٹاچاریہ کی پیدائش 24 ستمبر 1930 کو موضع فرید پور (مشرقی بنگال) میں ہوئی۔ ان کے والد کا نام بیکنٹھ ناتھ بھٹاچاریہ تھا جو حیدرآباد (دکن) میں ریلوے سے وابستہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ شانتی رنجن بھٹاچاریہ کا زمانہ طفلی حیدرآباد میں ہی گزرا، یعنی آٹھ سال سے لے کر تقریباً 27 سال کی عمر تک یہیں مقیم رہے۔ اور ان کی تعلیم و تربیت بھی اسی شہر میں ہوئی۔ 1965 میں حیدرآباد سے کلکتہ چلے آئے اور پھر مستقل یہیں قیام پذیر رہے۔ اس دوران ان کی کئی تخلیقات حیدرآباد کے مختلف اخبار و رسائل و جرائد میں شائع ہو چکی تھیں۔ شانتی رنجن کا آبائی وطن فرید پور ہے جو اردو کے مشہور شاعر ابوالقاسم محمد شمس کا بھی وطن ہے ان کے بارے میں وحشت کلکتوی نے لکھا ہے:

''اس کی زبان دیکھیں اور مرحوم کے وطن مشرقی بنگال کا تصور کریں۔ حیرت ہوگی کہ وہاں کا باشندہ یہ زبان کہاں سے لایا؟''

حالانکہ ان کی تعلیم کم تھی، یعنی وہ صرف میٹرک پاس تھے، لیکن ان کی بہترین تربیت ہوئی تھی۔ تربیت کا ہی نتیجہ تھا کہ وہ بہترین زبان پر قادر ہوگئے تھے۔ اردو زبان و ادب سے والہانہ وابستگی اور عشق کی حد تک دلچسپی نے ان کے اندر اردو میں زیادہ سے زیادہ کام کرنے کا شوق پیدا کر دیا تھا۔ ان کی جوانی اردو کی خدمت کے لیے وقف تھی ہی، اس کے بعد بھی یعنی بڑھاپے میں بھی انہوں نے اردو کے حوالے سے زریں خدمات انجام دیں۔ یہی وجہ ہے کہ سبکدوشی کے بعد بھی کلکتہ دوردرشن کے شعبہ اردو میں اعزازی ملازمت اختیار کر لی تھی۔ جب دوردرشن کلکتہ سے ''اردو نیوز'' کا آغاز ہوا تو انہوں نے اس کے لیے نمایاں خدمات انجام دی تھیں۔

درحقیقت شانتی رنجن بھٹاچاریہ بلند سیرت انسان، اردو کے مخلص اور سنجیدہ قلم کار تھے۔ بیک وقت اردو، بنگلہ دونوں ادبیات سے گہرا شغف رکھتے تھے۔ ان کی مادری زبان بنگلہ تھی، لیکن خود کو اردو کا ادیب کہلوانے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ انہوں نے 1948 سے لکھنا شروع کیا، اور اپنی ادبی زندگی کی شروعات عام شاعروں اور نوجوانوں کی طرح غزلوں سے کی، اور یہ اس لیے بھی ممکن ہوا کہ اس دور میں شاعری بالخصوص غزل کا چلن بہت عام تھا۔ اس لیے شانتی رنجن بھٹاچاریہ بھی تغزل کی وادیوں میں سیر کرتے کرتے غزل کے ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر میں غوطہ زن ہوگئے۔ یہ الگ بات ہے کہ چند ہی دنوں میں انہوں نے غزل کی شیرینی اور سوز و گداز سے منھ پھیر لیا، وہ بہت ہی منجھے ہوئے انسان تھے، ان کو احساس ہو گیا تھا کہ غزلوں سے وہ اپنے وقت کے تقاضوں کو پورا نہیں کر سکتے۔ غزل کی تنگ دامنی کا گلہ ان سے بہت پہلے غالب نے بھی کیا تھا، اور پھر علامہ اقبال بھی اس حقیقت سے بخوبی واقف تھے کہ وہ اپنے پیغامات اور خیالات کو عوام تک غزل کے ذریعہ نہیں پہنچا سکتے تھے۔ شاید یہی باتیں ان کے دماغ میں بھی آنے لگیں کہ وہ اپنے ہدف کو غزل سے پورا نہیں کر سکتے، لہٰذا شانتی رنجن نے اس راستے سے خود کو الگ کر لیا، کیونکہ یہ بات بالکل تسلیم شدہ ہے کہ غزل گوئی کسی انقلابی مقصد کی تکمیل میں اتنی معاون نہیں ہو سکتی جتنی کہ نظم یا افسانہ۔ جس طرح علامہ اقبال نے اپنے مقصد کی تکمیل کے لیے نظموں کا انتخاب کیا ہے، اسی طرح شانتی رنجن بھٹاچاریہ غزل گوئی ترک کر کے افسانہ نگاری کی طرف مائل ہوئے۔ یہ بھی بالکل صاف ہے کہ افسانہ میں عصری مسائل کو پیش کرنے کی صلاحیت بہت ہے، مزید یہ کہ ظلم و ستم اور جبر و استحصال کے خلاف افسانہ میں کھل کر لکھنے کی ہر ممکن گنجائش ہوتی ہے اور پھر اس کا اثر دیرپا بھی ہوتا ہے، اس کے علاوہ یہ بھی آسانی ہے کہ ہر طرح کا قاری اسے پڑھ اور سمجھ سکتا ہے، جبکہ غزل میں یہ ممکن نہیں ہے۔

انہوں نے جب ہوش سنبھالا تو انگریزوں کا ظلم و ستم چہار سو پھیلا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ ہندوستانی زمیندار، جاگیردار، سرمایہ دار بھی عوام پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑ رہے تھے۔ سماجی اعتبار سے بہت ساری خامیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ غرض یہ کہ بیسویں صدی کی پانچویں دہائی سیاسی اور سماجی اعتبار سے کافی اہم تھی، انگریزوں کے مظالم سے پورا ہندوستان متاثر تھا۔ غریب مزدور اور کسان کی حالت خستہ سے خستہ تھی۔ جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام کی دہشت اور ہولناکیوں سے طبقہ بہت ہی زیادہ متاثر تھا، یعنی ان لوگوں کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ شانتی رنجن بھٹاچاریہ نے اپنی زندگی میں کسانوں اور غریبوں پر ہونے والے مظالم کو بہت ہی قریب سے دیکھا، جس کا گہرا اثر ان کی ادبی زندگی پر پڑا، اور ان ہی سب وجوہات کی بنا پر بھٹاچاریہ غزل گوئی کو چھوڑ کر افسانہ نگاری کی طرف متوجہ ہوگئے۔ کوئی بھی حساس اور بیدار ذہن انسان کسانوں، غریبوں اور مظلوموں کی چیخ و پکار اور خون خرابہ دیکھ کر خاموش کیسے رہ سکتا ہے، لہٰذا انہوں نے تلنگانہ تحریک میں حصہ لے کر غریب کسانوں کی مدد اور انسانیت کی خدمت کی اور افسانہ نگاری کے ذریعہ انسانیت کو جگانے کی حتی المقدور کوشش کی۔

E-167/1، شاہین باغ، جامعہ نگر، اوکھلا، نئی دہلی
فون: 8826096452 mohdnaushad14@gmail.com

شانتی رنجن بھٹاچاریہ نے محض اٹھارہ سال کی عمر میں افسانہ نگاری شروع کی۔ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ''راہ کا کانٹا'' یکم اکتوبر 1960 میں شائع ہوا۔اس مجموعے میں کل 13 افسانے ہیں۔'امر کہانی۔1'، 'امر کہانی 2'، 'شانتی مر گیا'، 'سرمایہ کی ضرورت'، 'ایک دن کا راجہ'، 'راہ کا کانٹا'، 'رام نگر'، 'عورت اور ماں'، 'لہریں'، 'نوکری'، 'مٹی کے بھگوان'، 'جیت' اور 'رام نام ستیہ ہے' شامل ہیں۔

افسانہ ''امر کہانی۔ا'' میں افسانہ نگار نے بتایا ہے کہ کسان جو ہم سب کے لیے اپنے خون پسینے سے اناج اگاتا ہے اور ہم سب کے کھانے کا انتظام کرتا ہے، لیکن خود کا پیٹ بھرنے کے لیے اناج نہیں ہوتا ہے۔ وہ بھوک اور پیاس سے نبرد آزما ہوتے ہیں، زمینداروں کا ظلم سہتے ہیں۔ اس کہانی میں دولت اور محنت کی لڑائی کے ساتھ ساتھ بھوک کو ترجیحی حیثیت حاصل ہے۔کتاب کے مطالعہ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ''امر کہانی ا'' میں ملک میں آزادی کے بعد کے نامساعد اور ناگفتہ بہ حالات کو پیش کیا گیا ہے۔اس کے علاوہ غریب مزدوروں کی بود و باش کی عکاسی ہے۔ ان کے مکان کے چھپر ٹپکتے رہتے ہیں، سردیوں میں وہ کانپتے رہتے ہیں، ان کو اور ان کے اہل خانہ کو گرم کپڑا نصیب نہیں ہوتا کیونکہ مکان کی مرمت اور گرم کپڑے کے لیے پیسے کی ضرورت ہوتی ہے، اور ان کے پاس پیسے نہیں ہوتے۔اس کے علاوہ یہ بھی بتانا چاہتے ہیں کہ کسان کبھی مرتا نہیں، بلکہ وہ امر ہو جاتا ہے، کیونکہ وہ دوسروں کو زندگی دیتا ہے، وہ خود کبھی نہیں مرتا بلکہ مر کر بھی امر (یعنی ہمیشہ زندہ) رہتا ہے۔افسانہ ''امر کہانی ا'' کو پڑھنے کے بعد ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ کسانوں کی حالت کل بھی قابل رحم تھی اور آج بھی ہے۔

افسانہ ''شانتی مر گیا'' میں افسانہ نگار نے اپنی زندگی کے نشیب و فراز کو استعاراتی انداز میں پیش کیا ہے۔اس افسانے میں ہندوستانی تاریخ، تقسیم ہند، تقسیم بنگال، فسادات، ہجرت کا کرب، مشرقی بنگال کا سیاسی نظام کا عروج و زوال کا ذکر بہت ہی تفصیل سے ملتا ہے۔

افسانہ ''سرمایہ کی ضرورت'' میں سرمایہ دارانہ، جاگیر دارانہ نظام کے خلاف ایک احتجاجی آواز ہے، جس کو افسانہ نگار نے بہت ہی پر اثر انداز میں پیش کیا ہے۔اس کے علاوہ آزادی کے بعد کا سیاسی نظام، ہندوستان میں کمیونزم کو فروغ دینے کی کوشش اور کمیونسٹوں کے عروج کو بہت ہی خوبصورت اور افسانوی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔اس افسانے کا کردار ''لکشمیا'' سرمایہ دار ہے۔

افسانہ ''ایک دن کا راجہ'' متوسط طبقے کی زندگی سے متعلق ہے، اس میں بتایا گیا ہے کہ کس طرح متوسط طبقہ اپنی خواہشات کو دفن کر کے آگے بڑھنے کی کوشش کرتا ہے۔اس کے اہل خانہ کی نفسیاتی کشمکش، عام انسان کی روزمرہ کی زندگی اور نفسیاتی الجھن پورے افسانے میں نظر آتا ہے۔

افسانہ ''جیت'' میں بھی ملک کے ادیبوں اور شاعروں کی مفلسی اور بدحالی کی ترجمانی کی گئی ہے۔ادیب اور شاعر ایک سماج کو سنوارنے میں اپنی ہر طرح کی قربانی پیش کرتا ہے، لیکن ان کو اپنی بدحالی اور مفلسی نظر نہیں آتی ہے۔ایک ادیب اور شاعر پر سماج کی اصلاح کا جنون ہوتا ہے، حالانکہ ان کی مفلسی، اور ان کی اضطرابی کیفیت، ذہنی پیچیدگی اور کشمکش اسے نفسیاتی الجھن میں ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن وہ کبھی اپنی جنونی کیفیت سے سمجھوتہ نہیں کرتا، وہ ایک جانباز سپاہی کی طرح ہر مصیبت کو سلام کرتے ہوئے آگے بڑھ جاتا ہے۔

افسانہ ''لہریں'' میں افسانہ نگار نے عام غریب مزدور کی کہانی کے ذریعہ بے رحم و بے حس معاشرے پر زبردست طنز کیا ہے۔اس کے علاوہ معاشرہ کی برائی کو بھی اجاگر کیا ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی ہے، جس معاشرہ میں انسان اور انسانیت نہیں وہ معاشرہ حیوان اور حیوانیت کی طرح ہے۔

افسانہ ''رام نگر'' میں ایک خاص کردار کے ذریعہ مزدوروں کا استحصال، مہنگائی، نا آسودگی کے کرب کا بیان ہے اور سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف ایک آواز بھی ہے۔

افسانہ ''نوکری'' میں افسانہ نگار نے آزادی کے بعد کی مزدوروں کی مفلسی، فاقہ کشی اور بے روزگاری کو آئینہ دکھایا ہے۔یہ ایک مسئلہ ہے جو کل بھی ہمارے ملک میں حاوی تھا اور آج بھی دردسر بنا ہوا ہے۔

افسانہ ''مٹی کا بھگوان'' میں افسانہ نگار نے بنگال کی مٹی کی خوشبو، کلکتے کی عالیشان عمارتوں اور بنگال کی تہذیب و ثقافت کا عکس پیش کیا ہے۔افسانہ میں کہیں خوبصورت مناظر ہیں اور حسین طنز بھی۔

افسانہ ''راہ کا کانٹا'' میں افسانہ نگار نے آزادی کے بعد ملک کی ابتر سیاسی حالت، معاشی بحران اور بے روزگاری کے گوناگوں مسائل کو مختلف زاویوں سے پیش کیا ہے۔اس کے علاوہ افسانہ نگار نے یہ بھی بتانے کی کوشش کی ہے کہ فطری طور پر انسان کی نفسیاتی کشمکش جہاں کبھی غمِ جاناں پہ غمِ دوراں کو فتح اور کبھی غمِ دوراں پہ غمِ جاناں کا فتح ہونا نظر آتا ہے جو افسانہ نگار کے لیے راہ کا کانٹا بن جاتا ہے، ان سب حالات کو بہت ہی خوبصورتی اور دلکش انداز میں پیش کیا ہے۔ ''راہ کا کانٹا'' کو پڑھنے کے بعد ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ افسانہ نگار کا یہ مختصر مگر جامع مجموعہ ہے، انہوں نے فن کے ساتھ انصاف کیا ہے، اور سماج کے ایک جامع تھیم کو بھی پیش کیا ہے، جس کی جتنی بھی تعریف کی جائے وہ کم ہے۔

شانتی رنجن کا ایک طویل افسانہ ''شاعر کی شادی'' ہے جو 1961 میں شائع ہوا۔اس میں افسانہ نگار نے انسانی زندگی کے تقریباً تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔سماج کی برائیوں کو بھی چراغ دکھا کر سماج کے ٹھیکہ داروں کو بھی کٹہرے میں کھڑا کرنے کی کوشش کی ہے اور سرمایہ دارانہ ذہنیت کی غیر انسانی حرکات و سکنات کو طنزیہ انداز میں بیان کیا ہے۔اس افسانے کے ذریعہ انہوں نے یہ بھی بتانے کی کوشش کی ہے کہ ایک حقیقی شاعر اور مصلح سماجی دنیا کے ہر عیش و عشرت کو انسانیت کی خدمت کے مقابلے میں ہیچ سمجھتا ہے، اور غریب مزدوروں کی خدمت کرنا ہی اپنی زندگی کا مشن سمجھتا ہے۔ان کے افسانے میں ان شاعروں کے لیے ایک دعوت فکر بھی ہے جو انسان اور سماج کی خدمت کو بھول کر حصول زر میں مصروف ہو جاتے ہیں۔

نامور ادیب اور محقق ڈاکٹر خلیق انجم، شانتی رنجن بھٹاچاریہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''شانتی رنجن بھٹاچاریہ اردو کے مشہور اور ممتاز ادیب ہیں۔تقریباً چالیس برسوں سے اردو زبان و ادب کی خدمت کر رہے ہیں۔چونکہ بھٹاچاریہ صاحب کی مادری زبان بنگالی ہے اس لیے انہوں نے اردو میں ایسا کام خاصے پیمانے پر کیا ہے، جس میں بنگالی اور اردو دونوں زبانوں کا علم کام آیا ہے۔انہوں نے بنگال میں اردو ادب اور زبان کے موضوع پر بھی کئی کتابیں لکھی ہیں۔ان کے علاوہ بھٹاچاریہ صاحب نے کچھ بنگالی کتابوں کے اردو میں اور کچھ اردو کتابوں کے بنگالی میں بھی ترجمے کیے ہیں۔بھٹاچاریہ صاحب کی تحریروں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک سنجیدہ، ذہین اور محنتی ادیب اور محقق ہیں۔جب بھی کسی موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں اس کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ متعلقہ موضوع پر دستیاب تمام مواد سے استفادہ کریں۔''

الغرض ان کے افسانوں میں افسانوی رنگ ضرور ہے لیکن حقیقی زندگی کی جھلکیاں جا بجا ملتی ہیں۔افسانہ میں ان کی ذاتی زندگی کے تجربات و مشاہدات ہیں جن سے وہ دوچار بھی ہوئے ہیں۔ زندگی کے وہ سارے مسائل اور کرب کا بیان جو عام لوگوں کی زندگی میں پیش آتے رہتے ہیں۔ان کے افسانوں میں دیہات کا ماحول پیش کیا گیا ہے کیونکہ وہ خود بھی دیہات سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ تمام عمر انسانیت کی اعلیٰ قدروں کے متلاشی رہے۔بلا تفریق مذہب و ملت اور رنگ و نسل انہوں نے انسانیت کی ترقی کے لیے عمر بھر تگ و دو جاری رکھی۔مگر یہ بھی ہے کہ بسا اوقات انہوں نے مقصد کو حصول کے لیے فن کو سرے سے نظر انداز بھی کر دیا۔یعنی افسانہ لکھتے وقت وہ مقصد کو پیش رکھتے تھے، جس سے افسانہ کا فنی پہلو متاثر ہوتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ اپنی ادبی زندگی کا آغاز غزل گوئی سے کیا، پھر افسانہ نگاری کی، مگر اس میدان میں بھی بہت دیر تک قائم نہ رہے۔آخر میں وہ تحقیق و تنقید کی طرف مائل ہو گئے اور تخلیق کار کے ساتھ ساتھ محقق و ناقد بھی بنے۔جس موضوع میں بھی ہاتھ لگایا بھرپور کام کرنے کی کوشش کی۔

☆☆

سید سبط حسن نقوی



علی گڑھ میگزین، اکبر نمبر اور شبیہ الحسن نونہروی

علی گڑھ میگزین کا 1950 کا اکبر نمبر اپنی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ یہ نمبر پروفیسر رشید احمد صدیقی کی نگرانی، پروفیسر ظہیر الدین علوی کی مینیجر شپ اور شبیہ الحسن کی ادارت میں نکلا ہے۔ اس نمبر میں ۲۰ مضامین موجود ہیں۔ ان میں رشید احمد صدیقی، ڈاکٹر اعجاز حسین، خواجہ حسن نظامی، سید بشیر حسین، مولانا عبد الماجد دریا آبادی، عبد القادر سروری، ڈاکٹر محمد احسن فاروقی، جعفر علی خاں اثر، سید احتشام حسین، آل احمد سرور، خلیل الرحمن اعظمی وغیرہ کے قابل قدر مضامین شامل ہیں۔ مضامین کے علاوہ ضمیمے میں مختار الدین احمد آرزو کے خطوط اکبر اور خود شبیہ الحسن کے جمع کردہ نوادر اکبر بھی موجود ہیں۔ اس میں نوادر اکبر کے علاوہ شبیہ الحسن کا اکبر کے فن اور شخصیت پر ایک مضمون بھی شامل ہے۔ نمبر کو مفید بنانے کے لئے شبیہ الحسن نے بڑی تگ و دو کی ہے۔ نوادر اکبر کو انھوں نے محمود آباد کے کتب خانہ کی خاک چھاننے کے بعد جمع کیا۔ اودھ پنچ کی ۳۱ سال کی فائلوں کو کھنگال کر اس میں شائع اکبر کے مزاحیہ نثری مضامین اور منظومات کو جمع کر کے اکبر نمبر میں شائع کیا ہے۔ نثری مضامین کو جمع کرنے کی یہ پہلی کوشش ہے جس کو شبیہ الحسن نے انجام دیا ہے۔ اکبر الہ آبادی پر نمبر نکالنے کے پس پشت شبیہ الحسن کا کیا خیال تھا اسے انھوں نے خود شذرات میں بیان کر دیا ہے:

> ''اس خیال سے کہ ابھی اکبر الہ آبادی کے انتقال کو کم و بیش 30 سال کا عرصہ ہوا ہے اور ابھی وہ لوگ موجود ہیں جنھوں نے اکبر کو قریب سے دیکھا تھا اس کے علاوہ اکبر کے بہت سے اعزاء بھی موجود ہیں جو کافی مواد مہیا کر سکتے ہیں۔ جیسے جیسے زمانہ گزرتا جائے گا اکبر پر مواد کم ہوتا جائے گا، اسی لئے علی گڑھ میگزین کے اس شمارہ کو اکبر سے مخصوص کرنے کا تصفیہ کیا گیا''۔ (شذرات، صفحہ الف، علی گڑھ میگزین، اکبر نمبر)

اس نمبر کی ادبی حلقوں میں خوب پذیرائی ہوئی۔ طنز و مزاح پر آئندہ ہونے والی تحقیقات میں اس نمبر سے استفادے کے روشن نقوش نظر آتے ہیں۔ وزیر آغا کے تحقیقی مقالے 'اردو ادب میں طنز و مزاح' میں اس کے حوالے اور کتابیات میں اس نمبر کا ذکر ملتا ہے۔ وزیر آغا کی کتاب کے 1999 کے ایڈیشن میں صفحہ 121 پر آپ کو یہ حوالہ مل جائے گا (اکبر اور یورپ'' محمد احسن فاروقی، علی گڑھ میگزین 1950، ص 107) وزیر آغا نے اس حوالے میں دو لغزشیں کی ہیں۔ ایک تو حوالے میں 'وہ' کی جگہ اکبر لکھا ہے جو مراداً صحیح ہے لیکن متن کو نقل کرنے میں لغزش ہے جب کہ 'وہ' لکھ کر قوسین میں 'اکبر' لکنا چاہیے تھا۔ دوسری لغزش مضمون کے عنوان لکھنے میں ہوئی ہے، مضمون کو 'اکبر اور یورپ' لکھا ہے جب کہ مضمون کا عنوان 'اکبر الہ آبادی اور الیکز نڈر پوپ' ہے۔

'نوادر اکبر الہ آبادی' میں شبیہ الحسن نے اکبر کے مضامین اور منظومات اس دعوے کے ساتھ شائع کئے ہیں:

> ''ان اوراق میں آپ کو اکبر کی نثری تحریریں ملیں گی جو اکبر کی ادبی کاوشوں کا وہ نمونہ ہیں جو اب تک پردۂ خفا میں رہیں۔ اس کے علاوہ اکبر کی شاعری کی ایک ایسی صنف سے بھی تعارف ہوگا جو اب تک منظر عام پر نہیں آئی تھی۔ اور آپ اندازہ لگا سکیں گے کہ اکبر کی رزمیہ شاعری کی کیا قدر و قیمت ہے''۔ (علی گڑھ میگزین، ضمیمہ، صفحہ 2)

یہ ضمیمہ 44 صفحات پر مشتمل ہے اس میں 37 اوراق پر اودھ پنچ میں شائع اکبر کی نثر اور نظم موجود ہے۔ اکبر نمبر کے مضامین 256، شذرات 5، مکتوب گورنر عبد الرب نشتر، ضمیمہ 88، غالب نمبر مشاہیر کی نظر میں 2 صفحات، صفحہ اول اندر، فہرست، ایک تصویر کے تین ورق اور سادہ ورق اور سامنے کے رخ اور پشت کے صفحات کو جوڑ کر دیکھا جائے تو یہ نمبر 358 صفحات پر محیط ہے۔ اس نمبر کو شبیہ الحسن کی ادبی زندگی کا نقش اول قرار دیا جا سکتا ہے جو کہ پوت کے پاؤں اور پالنے کا آئینہ دار ہے۔

اکبر کے فن اور شخصیت پر ایک نظر:

'اکبر کے فن اور شخصیت پر ایک نظر' شبیہ الحسن کا پہلا مضمون ہے جو زیور طباعت سے مزین ہوا۔ یہ مضمون پہلی مرتبہ علی گڑھ میگزین 1950 میں چھپا، 1958 جب شبیہ الحسن نے ادارۂ فروغ اردو، لکھنؤ سے اپنے مضامین کا مجموعہ 'تنقید و تحلیل' کے عنوان سے شائع کرایا تو اس میں بھی یہ مضمون شامل ہوا۔ لیکن اس میں کچھ حک و اصلاح ہوئی۔ ایک تو اس کے عنوان میں سے 'پر ایک نظر' حذف کر لیا گیا اور دوسرے متن میں کہیں کہیں معمولی لفظی تبدیلیاں کی گئیں اور کہیں شعر کی جگہ مصرع سے کام چلا لیا گیا مگر نفس مضمون میں کسی قسم کی ترمیم نہیں ہوئی۔ مثال کے طور پر میگزین کے مضمون میں ملتا ہے، 'اکبر کو اکبر بنانے میں ان کی ذات کے علاوہ شاید اس زمانہ کا بھی بڑا حصہ ہے جس میں وہ پیدا ہوئے تھے' لیکن مجموعہ میں ذات کے مقام پر انفرادیت اور شاید کی لفظ ندارد ملے گی (علی گڑھ

337/426، ٹیپ والی گلی، سلطان بہادر روڈ، منصور نگر، لکھنؤ۔ 226003
فون: 9305 279697 sibtehasannaqvi@gmail.com

میگزین،ص202،تنقید وتحلیل،ص11)۔میگزین میں پورا شعر'لطف سخن تو ہے یہی ٹرس بھی ہووٹی بھی ہو.....ذہن کا وصف ہے یہی اور ٹینیلٹی بھی ہو،مجموعہ میں مصرعہ ثانی نہیں ہے،(میگزین ،ص203،تنقید وتحلیل،ص13)۔اسی طرح کے معمولی تغیرات دونوں نسخوں میں ملتے ہیں۔

تنقید وتحلیل کے عنوان سے'پرایک نظر' کا حذف کرنا ذہن کو اپنی طرف منعطف کرتا ہے۔اگر مضمون کا عنوان وہی رہتا تو اس کا جواز یہ ہوسکتا تھا کہ انھوں نے اپنے مشفق استاد رشید احمد صدیقی کی تاسی میں 'پرایک نظر' کا اضافہ کیا ہے کیوں کہ میگزین میں شامل ان کے مضمون کا عنوان 'اکبر پرایک نظر' ہے،لیکن اس کو قطع کرنا تجسس کو پیدا کرتا ہے۔اردو ادب کا ادنیٰ طالب علم بھی 'اردو شاعری پرایک نظر،اردو تنقید پرایک نظر' سے واقف ہے۔یہ کلیم الدین احمد کی کتابوں کے عنوانات ہیں۔کلیم الدین کا انداز جارحانہ اور دوٹوک ہے۔اردو تنقید پرایک نظر میں وہ حالی کے متعلق دوٹوک فیصلہ کرتے نظر آتے ہیں:

''حالی کی نظر سطحی تھی اور یہ سطحیت ہر جگہ ملتی ہے(ص90،ایڈیشن1983)''

''خیالات ماخوذ،واقفیت محدود،نظر سطحی،فہم وادراک معمولی،غور وفکر نا کافی،تمیز ادنیٰ،دماغ وشخصیت اوسط۔یہ تھی حالی کی کائنات۔(ص 110)''۔

اب شبیہ الحسن کی اکبر الہ آبادی پر آرا کو ملاحظہ کیجئے:

''ان کی شخصیت بذات خود اتنی اہم اور وسیع نہیں تھی کہ وہ اپنی ظریفانہ شاعری کے مواد سے اس کے خارجی لوازم یا بیرونی اثرات کو جدا کر سکتے (تنقید وتحلیل،ص16)''

''وہ کوئی ایسی بات بہت کم کہہ سکتے ہیں جو خالص ذہانت (Pure Intelligence) کو اپیل کرے(ص14،کتاب کے متن میں انٹلی جینس میں ای کی جگہ اے چھپا ہے، یہاں اسے صحیح کر کے لکھا گیا ہے)''

''ان میں ایک بڑے مزاح نگار کی طرح اتنی وسعت نہیں تھی (ص16)''

''ان کی بصیرت اوسط درجہ سے زیادہ نہیں تھی۔وہ مغربی افعال اور مغربیت میں فرق نہیں کر سکتے تھے(ص28)''

مذکورہ اقتباسات کی روشنی میں یہ نتیجہ بآسانی نکالا جاسکتا ہے کہ اپنے پہلے مضمون میں شبیہ الحسن کلیم الدین احمد کے انداز سے متاثر تھے۔لیکن یہ اثر زیادہ پروان نہیں چڑھ سکا اور شبیہ الحسن کے دیگر مضامین اور تحریروں میں اس انداز کی تکرار نمایاں طور پر نہیں ملتی ہے۔مضمون کے عنوان سے'پرایک نظر' کی محذوفیت کلیم الدین احمد کے اثر سے باہر آنے کی غماز بھی ہے۔

تجزیہ : شبیہ الحسن کا مضمون (اکبر کا فن اور شخصیت) دو حصوں میں منقسم نظر آتا ہے۔ابتدائی حصہ میں نظری مباحث اور دوسرے حصہ میں اکبر کے فن اور شخصیت پر بحث ہے۔آغاز میں ظرافت نگار کی خصوصیات،ظرافت اور زبان کا رشتہ،ماحول اور ظرافت کی نمود کا مختصر بیان ہے۔نظری مباحث میں مضمون نگار نے طنز،مزاح اور وٹ کی تعریفوں کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔طنز،مزاح،وٹ اور ہجو کو ایک ہی جنس تصور کیا ہے اور ان کو ایک ہی جنس کی مختلف نوعیتیں قرار دیا ہے۔ظرافت کی تشکیل کے تین اجزاء بتائے ہیں،احساس برتری،تمسخر اور زہرناکی یا غم وغصہ۔''اگر ظرافت کی تحلیل کی جائے تو اس میں بالعموم تین جزو نکلتے ہیں،احساس برتری،تمسخر اور زہرناکی یا غم وغصہ'(تنقید و تحلیل،اشاعت2000،ص11)۔ان اجزاء کے مختلف مقدار میں ایک دوسرے میں ضم ہونے سے ظرافت کی قسمیں وجود میں آتی ہیں۔وہ لکھتے ہیں:

''ان اجزاء کی مخصوص کیمیاوی ترکیب سے وابستہ ہے بالفاظ دیگر انہیں اجزاء کو ایک مخصوص مقدار میں مرکب کرنے سے ہجو پیدا ہوتی ہے،اسی مقدار کے ایک مخصوص تغیر کے بعد طنز وجود میں آتا ہے اور انہیں اجزاء کی مقدار کا ایک دوسرا تغیر خالص مزاح پیدا کرتا ہے۔''

(تنقید وتحلیل،اشاعت2000،ص12)

شبیہ الحسن نے اس اعتراف کے ساتھ''طنز،مزاح یا وٹ (Wit) کی کوئی قطعی تعریف بھی ممکن نہیں ہے(ایضاً ص12)''طنز،مزاح اور وٹ کی شناخت کے متعلق کچھ نکات کو بیان کیے ہیں۔طنز کے متعلق کہتے ہیں،''صحیح طنز وہ ہے جہاں زیادہ تمسخر،کم زہرناکی اور کم احساس برتری ہو(ایضاً ص12)''۔وٹ کے بارے میں بین (Bain) کے حوالے سے لکھتے ہیں،''وٹ لفظوں کا کھیل ہے،لفظوں کا ایجاز (Economy of words) وٹ کی سب سے ضروری شرط ہے(ایضاً 12)''۔مزاح کو یوں بیان کرتے ہیں،''مزاح انسان کی فطری یا خود اپنے اوپر عائد کردہ مضحکہ انگیز چیزوں کی نقالی یا بیان ہے(ایضاً ص13)''۔ولیم ہیزلٹ (William Hazlitt) کے لکچروں سے حاصل اشاروں کی روشنی میں وٹ اور مزاح کے فرق کو اس طرح پیش کرتے ہیں،''وٹ صناعی اور تخیل کی پیداوار ہوتی ہے،بالفاظ دیگر اگر تمسخر انگیز کا بحیثیت تمسخر انگیز کے بیان ہو تو وہ مزاح ہے اور اگر تقابلی مطالعہ کیا جائے اور کسی ضد کو سامنے رکھ کر ایک دوسرے کا ظریفانہ انداز سے موازنہ کیا جائے تو یہ وٹ ہے(ایضاً ص13)''۔ظاہر ہے کہ ان اشاروں سے قاری کے ذہن میں طنز،وٹ اور مزاح کی کوئی واضح تصویر نہیں بنتی البتہ صحیح طنز اور وٹ کے بارے میں کچھ اشارے ضرور مل جاتے ہیں۔مزاح کی تصویر مبہم رہتی ہے۔اس کا سبب یہ ہے کہ وہ اکبر کی شاعری کا محور وٹ کو گردانتے ہیں۔

شبیہ الحسن ظرافت کی سب سے اعلیٰ قسم مزاح کو بتاتے ہیں اور برگساں کے قول Its appeal is to pure intelligence سے مزاح کی تخلیق کو ذہانت سے جوڑتے ہیں۔ظاہر ہے کہ ذہانت انسانی شخصیت کا حصہ ہے لہٰذا مزاح نگاری ادیب کی شخصیت سے منسلک ہوجاتی ہے۔ذہانت کے میزان پر اردو کے ظرافت نگاروں کو تولنے پر شبیہ الحسن کسی قسم کے اطمینان کا اظہار نہیں کرتے،وہ لکھتے ہیں:

''خالص مزاح کی آفرینش کے لئے شخصیت کی جتنی عظمت اور ادراک کی جس وسعت کی ضرورت ہے اس کے حامل ہمارے بہت کم ادیب نظر آتے ہیں(ایضاً ص15)''۔خالص مزاح کیسے پیدا ہوتا ہے،اس کے لئے وہ کہتے ہیں''خالص مزاح بغیر تجرید کے ممکن نہیں (ایضاً ص15)''

تجرید سے کیا مراد ہے جو خالص مزاح کی تخلیق کے لئے ضروری ہے؟ شبیہ الحسن نے براہ راست تو اس سوال کا جواب نہیں دیا ہے لیکن ان کے خیالات سے جو بات منکشف ہوتی ہے اس کے ضمن میں کہا جاسکتا ہے کہ انفرادیت سے آفاقیت اور آپ بیتی کو جگ بیتی بنا دینا تجرید ہے۔ ظرافت نگار اپنے وسیع تجربات سے اپنی ذہانت کے بل پر مضحک چیزوں کو اپنی گرفت میں لاتا ہے اور پہلے اس پر خود ہنستا ہے اور اس مواد سے شخصی پن کو دور کر کے اس میں عمومی یا آفاقی رنگ پیدا کرتا ہے،اس کو شبیہ

الحسن نے اس طرح بیان کیا ہے ''دوسرے اشخاص کے ذہنوں کو ان راہوں سے روشناس کرے جن سے وہ خود پہلے چل چکا ہے اور اس طرح وہ ایک ایسے ماحول کو پیدا کر لیتا ہے جو دوسرے اشخاص کو ہنسنے پر مجبور کر دیتا ہے، یہی وہ چیز ہے جس کو ادب میں مزاح کہا جاتا ہے (ایضاً ص ۶۱)''۔ وہ ہنسنا ہنسانا اور مزاح میں فرق پیدا کرتے ہیں اور مزاح کے ساتھ فکر انگیز ماحول کو لازمی قرار دیتے ہیں جب کہ ہنسنا یا قہقہہ دونوں میں مشترک ہے۔ وہ مزاح کے تعلق سے کہتے ہیں کہ ''اس میں اتنی قدرت ہونی چاہیے کہ وہ ساتھ ساتھ ایک فکر انگیز ماحول بھی پیدا کر سکے'' (ایضاً ص 15)۔

شبیہ الحسن نے اکبر الہ آبادی کے کلام میں طنز و مزاح کے نمونے تو دیکھے لیکن ان کا غالب رجحان وِٹ ہی کو قرار دیا ہے۔ اعلیٰ مزاح نگار کے لئے جس ذہانت کی ضرورت ہوتی ہے اس سے اکبر کو محروم اور ان کی شاعری کو آفاقیت کے درجہ تک پہنچنے سے قاصر سمجھا ہے۔ اس طرح کے فیصلے ان کے مضمون میں مل جاتے ہیں:

''ان کی شاعری آفاقی سطح پر آنے کی بہت کم قوت رکھتی ہے (ایضاً ص 14)''

''ان کی شخصیت بذات خود اتنی اہم اور وسیع نہیں تھی کہ وہ اپنی ظریفانہ شاعری کے مواد سے اس کے خارجی لوازم یا بیرونی اثرات کو جدا کر سکتے یا اس سے شدید شخصی اثرات کو الگ کر سکتے اور اسے آفاقی سطح پر لا سکتے، اسی وجہ سے وہ کوئی بات بہت کم کہہ سکتے ہیں جو خالص ذہانت کو اپیل کرے۔ (تنقید و تحلیل، ص 16)''

''اکبر الہ آبادی کی شاعری میں قہقہہ ضرور ہے لیکن مزاح شاذ و نادر ہے''۔ (ایضاً ص 16)۔

''اکبر کا فن جہاں لفظی ظرافت کے محور پر گھومتا ہے وہاں بلند نہیں کہا جا سکتا پھر بھی لفظی صناعی کو بعض جگہ انھوں نے بڑے سلیقہ سے نباہا ہے''۔ (ایضاً ص 24)

''خیال کی ظرافت پیدا کرنے میں اکبر نے اکثر بہت جدت سے کام لیا ہے اور کامیاب رہے ہیں معنی کی ظرافت سے ان کے کلام میں اور اقسام کے مقابلہ میں کم ہے''۔ (ایضاً ص 24)

''اکبر کے لئے ایک بڑے شاعر کی طرح یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ زندگی کے ان جزئیات کو جمع کر کے جو انسانی ذہن پر براہ راست اثر ڈالتے ہیں، کوئی اظہار خیال کریں''۔ (ایضاً ص 26)

''اکبر کے یہاں سطحیت ان کے شدید جذبۂ تنفر (مغربیت سے) کی وجہ سے تھی''۔ (ایضاً ص 34)

کچھ منفی فیصلوں کا ذکر کلیم الدین احمد کے انداز کے تقابل میں بھی ہو چکا ہے۔ اب کچھ مثبت نتائج پر بھی روشنی ڈالی جائے تا کہ مضمون کے توازن کا کچھ حد تک اندازہ ہو سکے۔

''اکبر کی خصوصیت ہے کہ انھوں نے اردو شاعری میں ایک نئی روایت شروع کی اور اسے خود کمال تک پہنچایا'' (ایضاً ص 11)۔

''اکبر جب کسی واقعہ سے متاثر ہو کر زندگی پر کوئی ریمارک کرتے ہیں تو وہ بالکل ارضی اور براہ راست معلوم ہوتا ہے اسی لئے اکبر خواہ اپنے دماغ کے کسی خانہ سے کوئی بات نکالیں وہ نشانہ پر ٹھیک بیٹھتی ہے۔ (ایضاً ص 25)''

''اکبر الہ آبادی پہلی شخصیت ہیں جنھوں نے انگریزوں کی معاشی لوٹ کھسوٹ پر بہت واضح انداز میں اظہار خیال کیا''۔ (ایضاً ص 35)

اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ جہاں شبیہ الحسن نے کوئی تعریف کا پہلو نکالا ہے وہیں ذم کا پہلو بھی رکھ دیا ہے جہاں انھوں فکر کی بلندی کو ابن عربی تک پہنچایا ہے وہیں سرکس کے جوکر تک بھی آ پہنچتے ہیں۔ یہ اتار چڑھاؤ پورے مضمون میں ملتے ہیں۔ اکبر کے تعلق سے شبیہ الحسن کا یہ منفی رخ کس سبب سے تھا؟ یہ سوال ذہن میں ابھرتا ہے۔ یہ بات جگ ظاہر ہے کہ اکبر مشرقی تہذیب کے دلدادہ اور مغربی تہذیب کے سخت ناقد تھے، تو کیا شبیہ الحسن مغرب پرست تھے جو اکبر کو متعصّبانہ نظر سے دیکھتے تھے؟ نہیں، ایسا نہیں ہے تو پھر کیا جواز ہو سکتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے طالب علم اور سرسید سے لگاؤ ہونے کے سبب ان کا رخ اکبر کے لئے یک رخا ہوا ہے۔ یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ اکبر سرسید تحریک اور ان کے کالج کے مخالف تھے گو کہ محسن الملک نے اکبر کو سرسید کے تعلق سے نرم کیا تھا اور دونوں کی ملاقاتیں بھی ہوئیں اور وہ سرسید سے متاثر بھی ہوئے۔ سرسید کے انتقال پر انھوں نے کچھ ستائشی اشعار بھی کہے لیکن عمومی طور پر وہ سرسید کے مخالف ہی رہے۔ سرسید کے بیٹے جسٹس سید محمود کے انتقال پر انھوں نے کہا،

مٹ گیا نقش احمد و محمود
رہ گیا لا الہ الا اللہ

اکبر کے کلام میں کالج اور مسلم یونیورسٹی کے خلاف خوب شعر مل جاتے ہیں۔ ان کا مشہور شعر ہے:

یوں قتل پہ بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

ایک شعر خود شبیہ الحسن نے اپنے مضمون میں بھی لکھا ہے،

دین کی الفت دلوں سے ان کے یوں ہی گر مٹی
مسلم اٹھ جائیں گے رہ جائے گی یونیورسٹی

شبیہ الحسن نے سرسید اور اکبر کا تقابل بھی کیا ہے اور اکبر کو ان کے مقابلہ میں پست بھی کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''اکبر کی مسلمانوں سے محبت صوفیانہ ہے جس میں جدوجہد کا کوئی عملی پہلو نہیں ملتا جب کہ سرسید اس کے بالکل برعکس ہیں۔ ایک بڑا نکتہ جو اکبر کو نہیں معلوم تھا اور سرسید کو معلوم تھا یہ ہے کہ مسلمانوں کے زوال کا سبب صرف دین سے دوری نہیں بلکہ دنیا سے دوری بھی ہے'' (ایضاً ص 32)۔

اکبر کے متعلق منفی رویہ پر کسی بھی نقاد نے شبیہ الحسن کی گرفت نہیں کی، اس کا سبب یہ تھا کہ اکبر کے متعلق جدید نقادوں کی رائے مثبت تھی ہی نہیں۔ شمس الرحمن فاروقی لکھتے ہیں:

''اکبر کے قدح خواں (اور قریب قریب سب ہی جدید نقاد اکبر کے قدح خوں ہی ہیں)''۔ (کتاب جدیدیت آج اور کل، مضمون، اکبر الہ آبادی

:نئی تہذیب سیاست اور بدلتے ہوئے اقدار،ص165)

فاروقی صاحب نے جدید نقادوں کی آرا کو بیان کر کے ان کے جواب دیے ہیں، یہاں ہم جدید نقادوں کے خیالات کو لکھیں گے اور جوابات سے اجتناب کریں گے :

''اکبر کے بارے میں زیادہ تر جدید تنقید میں تصور کی تہہ دھارا اور بعض اوقات بالکل کھلی کھلی رائے یہی ہے کہ ٹھیک ہے، وہ اپنے زمانہ میں بے حد مقبول تھے اور عمدہ طنزیہ شاعر تھے لیکن جن اقدار، تصورات اور آدرشوں کو وہ قیمتی گردانتے تھے انھیں تو اکبر کے حین حیات میں شکست فاش نصیب ہو چکی تھی۔ لہٰذا جب وہ اقدار ہی نہ رہے جن سے اکبر کی شاعری کو ایقان اور عقیدے کا سہارا تھا تو پھر ناگزیر ہے کہ ان کی شاعری دوسروں کے لئے جگہ خالی کر دے۔ نقادوں کا کہنا یہ ہے کہ اکبر کا گوشوارۂ عمل منفی ہے اس لئے ان کی شاعری بھی منفی ہے اور ہم اسے آج کے جدید دور میں نہ کسی قوت کا حامل دیکھ سکتے ہیں نہ معنویت کا''۔

(ایضاً ص166)۔

جدید نقادوں نے راحت رسانی کی چیزوں کو سامنے رکھ کر اکبر کو نشانہ بنایا ہے۔ شبیہ الحسن بھی اس میں شامل ہیں، وہ لکھتے ہیں:

''انھوں نے مشرق کو مغرب کی ذہنی غلامی سے بچانے کی کوشش کی وہاں انھوں نے بجلی کی روشنی، پائپ کا پانی، ٹائپ کا حرف اور اس قسم کے بے شمار چیزوں کے خلاف بھی احتجاج شروع کر دیا'' (ایضاً ص27)

شمس الرحمن لکھتے ہیں:

''اکبر کے کلام کا وہ حصہ جدید نقادوں کے لئے سب سے زیادہ برہمی کا باعث بنا ہے، جہاں وہ پائپ کے پانی اور چھاپہ خانہ اور اخبار اور ریل گاڑی جیسی کھلی ہوئی منفعت بخش اشیا و ایجادات کو بھی بظاہر مسترد کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ سرسری نظر سے پڑھیے تو واقعی تعجب بلکہ افسوس بھی ہوتا ہے کہ اکبر نے جدید اور روشن خیال زندگی کی ایسی کارآمد اور ضروری اشیا کا خیر مقدم کرنا تو کجا، انھیں اپنے یہاں بار دینے سے بھی انکار کیا۔ لیکن اصل معاملہ کچھ اور ہے۔ اکبر کا احتجاج ترقی کے ان نئے وسائل کے خلاف نہ تھا، ان کا احتجاج یہ تھا کہ ان کی نظر میں یہ نئی چیزیں غلامی کی علائم تھیں اور یہ کہ نام نہاد ترقی اور بہتری کے پردے میں یہ تبدیلیاں ہندستانی طرز معاشرت اور تہذیب کو تباہ کرنے کا کام کر رہی تھیں۔ اب تبدیلیوں (مثلاً پانی کے نل کے ذریعے گھر بیٹھے پانی کی سہولت) کا فائدہ تو چند ہی لوگ اٹھا سکتے ہیں۔ لیکن اکبر کی نگاہیں پانی کے پائپ کے ساتھ واٹر ٹیکس، سڑکوں پر کیچڑ اور آب استادہ کی فراوانی اور اس کے پیدا کردہ ماحولیاتی آلودگی پر بھی تھی.....

طاعون و تپ و کھٹمل مچھر سب کچھ ہے یہ پیدا کیچڑ سے
بمبے کی روانی ایک طرف اور ساری صفائی ایک طرف
کشتِ دل کو نفع پہنچے اشک ایسی چیز ہے
دیدۂ گریاں پہ واٹر ٹیکس کی تجویز ہے
یہ موج فیض ہے تہذیب کی یا اس کا طوفاں ہے
کنواں موجود ہے گھر میں تو پھر پانی کا نل کیسا...''

(ایضاً ص175)

شبیہ الحسن کے اس مضمون کا تجزیہ کرتے وقت یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ جب یہ مضمون انھوں نے قلم بند کیا تھا اس وقت ان کی عمر محض 22 سال تھی اور انھوں نے اسی سال ایم اے اردو کا امتحان پاس کیا تھا۔ وہ علی گڑھ میگزین کے ایڈیٹر تھے اور انھوں نے بحیثیت مدیر سبھی مضامین کا مطالعہ کیا تھا۔ جدید نقادوں کی رائے سے متاثر ہونا ایک نو وارد کے لئے کوئی خاص بات نہیں ہے۔ پانی کے بہاؤ میں تیرنا آسان بھی ہے اور راحت رساں بھی۔ اس کے علاوہ تعلیم گاہ اور اس کے بانی سے الفت کا جذبہ بھی فطری ہے۔ انھیں سب باتوں کی روشنی میں دیکھا جائے تو شبیہ الحسن کے یک رخے پن کی توجیح اپنے آپ ہو جاتی ہے۔

☆☆☆

ماہنامہ 'آجکل' کا سالانہ چندہ

ماہنامہ 'آجکل' (اردو) کے سالانہ چندہ کی شرحیں حسب ذیل ہیں:

رجسٹرڈ ڈاک سے رسالہ منگانے کے لیے

سالانہ	434روپے
دوسال کے لیے	838روپے
تین سال کے لیے	1222روپے

سالانہ چندے کی رقم بذریعہ پوسٹل آرڈر/ ڈیمانڈ ڈرافٹ بنام ڈائریکٹر جنرل پبلی کیشنز ڈویژن قابل ادا، نئی دہلی ارسال کریں۔ آن لائن ادائیگی کے لیے ملاحظہ کریں ویب سائٹ۔

www.publicationsdivision.nic.in

بزنس منیجر، پبلی کیشنز ڈویژن

7th فلور، سوچنا بھون، سی جی او کمپلیکس، لودھی روڈ، نئی دہلی۔110003

فون نمبر:24365609----011-24367260

ضروری اطلاع

ادارے میں شائع تخلیقات کا اعزازیہ اب ECS کے ذریعے سیدھے بینک کھاتے میں جاتا ہے۔ اس لیے جن تخلیق کاروں کی بینک ڈیٹیل ادارے میں پہلے سے نہیں ہے اور وہ اس سسٹم کے شروع ہونے کے بعد پہلی بار شائع ہو رہے ہیں مضمون، افسانہ، شاعری، تبصرے شائع ہونے کے بعد فوری طور پر پاس بک کی فوٹو کاپی، پین کارڈ کی کاپی اور کینسل شدہ چیک کی کاپی آجکل کے ای میل ajkalurdu@gmail.com پر بھیجیں۔ تاخیر سے ملنے پر ادارہ اعزازیہ کی رقم کی ادائیگی کا ذمہ دار نہیں ہوگا۔ (ادارہ)

ڈاکٹر ارشاد شفق





اعزاز افضل کے صحافتی قطعات

مغربی بنگال کے اردو شعراء میں اعزاز افضل کا نام محتاج تعارف نہیں ہے۔عملی زندگی میں وہ کلکتہ یونیورسیٹی کے شعبۂ اردو سے منسلک تھے لیکن موصوف کی شناخت ان کی وہ ادبی کاوشیں ہیں جن کی بدولت اردو دنیا میں انہیں ایک الگ اور منفرد مقام حاصل ہوا۔''زخم صدا'' اور ''ان پڑھ آندھی'' جیسے شعری مجموعے ان سے یادگار ہیں جو اردو شاعری میں اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ بالخصوص بنگال میں ترقی پسند شاعری کے حوالے سے ان کا نام احترام سے لیا جاتا ہے۔انہوں نے بڑی فنکاری اور سلیقگی سے شاعری کے ریشمی آنچل میں ترقی پسند موضوعات کو جگہ دے کر یہاں کی شاعری کو ترقی پسند فکر وشعور سے آشنا کیا۔اعزاز صاحب کے ان مجموعوں میں یوں تو غزلیں اور نظمیں دونوں ملتی ہیں جو اپنی ایک الگ انفرادیت اور آب تاب سے شعری افق پر اہمیت کا درجہ رکھتی ہیں لیکن ادب کی ان اصناف سے ہٹ کر بھی انہوں نے اپنی ایک الگ شناخت بنائی۔ وہ کلکتہ کے روزنامہ اخبار ''آزاد ہند'' اور ہفتہ وار ''اُجالا'' سے نہ صرف جڑے ہوئے تھے بلکہ ہر روز مختلف موضوعات پر ان کے قطعات ان اخبارات میں شائع ہوتے رہتے تھے، جو ایک مکمل مجموعے کی صورت میں ''قلم برداشتہ'' کے عنوان سے عثمانیہ بک ڈپو(کلکتہ) سے 1996 میں شائع ہوئے۔ان اخبارات کے علاوہ روزنامہ 'آبشار' اور اس کے عید نمبر سے بھی موصوف کا تعلق رہا جس میں ان کے قطعات مسلسل شائع ہوتے رہے۔موصوف کی صحافتی قطعہ نگاری کو جس اخبار نے سب سے زیادہ فروغ دیا وہ 'آزاد ہند' تھا کیونکہ کلکتہ کے دیگر اخبارات کے برعکس 'آزاد ہند' سے ان کا رشتہ تقریباً 12 سال استوار رہا جس میں وہ اپنے مزاج کے اعتبار سے قطعات رقم کرتے رہیں۔

اعزاز افضل کے قطعات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔انہوں نے عام قطعہ نگار سے ہٹ کر ایک صحافی کی حیثیت سے قطعات کو شعری پیکر عطا کیا۔عام قطعہ اور صحافتی قطعہ نگاری میں بہت سی باتیں مشترک ہونے کے باوجود بھی اس کے فنّی رکھ رکھاؤں میں بہت نمایاں فرق ہے۔مثلاً عام قطعہ نگار کے یہاں کہنے کو بہت کچھ ہے، وہ جس موضوع پر چاہے اپنے مزاج اور تخیل کو بروئے کار لا کر قطعہ رقم کرسکتا ہے لیکن صحافتی قطعہ لکھتے وقت شاعر کو بہت سی بنیادی اور فنّی پہلوؤں کو ملحوظ خاطر رکھنا پڑتا ہے۔وہ عام قطعہ نگار کی طرح ہر موضوع پر قلم نہیں اٹھا سکتا نہ ہی وہ اس میں جذبات اور تخیل کی آمیزش کرسکتا ہے۔ایسا اس لئے کہ صحافتی قطعہ کا دار مدار زیادہ تر ترسیل سے وابستہ ہوتا ہے جس کے ذریعے عوام کو اس واقعہ کی طرف توجہ دلانا مطلوب ہوتا ہے جس واقعہ کو شاعر اخباری صفحات پر بیان کرتا ہے گویا صحافتی قطعہ میں موضوع پہلے سے شاعر کے ذہن میں طے ہوتا ہے جسے وہ بغیر کسی مزاحمت کے پیش کرتا ہے۔ اس کے علاوہ عام شعری قطعات میں شاعر کے جذبات واحساسات، اس کی دلی کیفیات کا بیان ممکن ہے جبکہ صحافتی قطعہ نگار کے لئے داخلیت سے قطع نظر خارجیت کے عنصر کو نمایاں کرنا اس کا سب سے پہلا اور اہم فریضہ ہے۔ایسے قطعات میں شعری حسن کارفرما ہوسکتا ہے لیکن ان قطعات کا تعلق چونکہ عوام سے ہے اور ان کا نقطۂ نظر صحافتی ضروریات کو پروان چڑھانا ہوتا ہے، اس لئے صحافتی قطعہ نگار عوامی ترسیل میں مزاحمت پیدا کرنے کے بجائے براہ راست اپنی بات پیش کرتا ہے۔اعزاز افضل کے قطعات کے مطالعے سے اس حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے کہ انہوں نے صحافتی قطعات کی تمام تر خوبیوں کو نہ صرف پیش نظر رکھا ہے بلکہ اپنی ژرف نگاہی اور فنّی دروبینی سے اس میں بیش بہا اضافے بھی کئے ہیں۔ان کے صحافتی قطعات عام شعری قطعات سے بہت حد تک الگ اور منفرد نظر آتے ہیں جس میں شاعر کا نقطۂ نظر اور زبان وبیان کی سادگی کا ایک الگ عنصر موجود ہے۔اس حقیقت کا احساس انہیں بھی تھا کہ عام شعری قطعات اور صحافتی قطعات کے فن میں واضح فرق ہے۔شاید یہی وجہ ہے کہ موصوف یہ کہنے پر مجبور ہوئے:

شاعری میں صحافتی انداز
کون اپنائے گا ہمارے بعد
روز سوکھی سپاٹ بحروں میں
ڈبکیاں کھائے گا ہمارے بعد

اعزاز افضل کے قطعات میں ملک کے سیاسی، سماجی اور معاشی زندگی کی عکاسی، بعض سیاست دانوں کی مکاری، بستی میں رہنے والے لوگوں کی کسمپرسی، بھوک مری، رشوت خوری، بے روزگاری، عالمی سیاست، دین فروشی اور عوامی بدحالی جیسے نازک مسائل پر باریک بیں نظریں مرکوز کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہیں۔دراصل صحافتی قطعہ نگار کے یہاں موضوع کی بہتات ہے۔وہ حالاتِ حاضرہ پر دوٹوک اپنا مافی الضمیر بیان کرتا ہے۔گویا اس کے پاس موضوع کا ندھے پر چل کر آتے ہیں اور وہ محض قطعات کے فنّی خصائص کو ذہن میں رکھتے ہوئے اسے پروتا جاتا ہے۔اعزاز افضل کے یہاں بھی

ہولڈنگ نمبر A-1، بی ایل نمبر 23، کیلا بگان، جگتدل، نارتھ 24 پرگنہ (مغربی بنگال): 743125
فون: 8100035441 Irshadnsr5@gmail.com

ہمیں ہر موضوع پر اچھے اور بہترین قطعات مل جاتے ہیں۔

عام طور پر اخبارات میں سیاست کا عمل دخل زیادہ ہوتا ہے اور بیشتر سیاسی خبریں ہی لوگوں کی توجہ کا مرکز ہوا کرتی ہیں۔ صحافت سے جڑا ادیب اپنے ماحول اور زندگی کے تلخ وشیریں حقائق سے نبرد آزما ہوتا ہے اس لئے سیاست کو ادب میں پرونے سے وہ گریز نہیں کرتا۔ اعزاز افضل کے یہاں اپنے عہد کے سیاسی افکار ونظریات بھرپور انداز میں موجود ہیں۔ انہوں نے اپنے قطعات میں بڑی فنکاری سے حقائق کو بے نقاب کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ ان کے دو قطعات ملاحظہ کیجئے:

بس جلائیں، ٹرام کو پھونکیں — راج نیتی کا یہ مزاج نہیں
پر تشدّد مظاہرے کرنا — شر پسندی ہے، احتجاج نہیں
(نراج نیتی)

آج وہ اشیاء بھی عنقا ہوگئیں — منڈیوں میں جن کی تھی کل ریل پیل
شہر کے سینے سے اٹھتا ہے دھواں — ہائے بجلی، ہائے پانی، ہائے تیل
(دھواں دھواں شہر)

اعزاز افضل نے معاشرے کی بدحالی کو نہ صرف اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھا تھا بلکہ محسوس بھی کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے قطعات میں سماجی شعور کا عمل دخل اپنے عروج پر ہے۔ انہوں نے معاشرے کے تلخ حقائق سے دامن چھڑانے کے بجائے سماجی زندگی کی الجھن اور اس سے جڑے بے شمار انسانی مسائل کو موضوع بنایا۔ ان کے قطعات میں سماجی شعور بہت پختہ اور نکھرا ہوا ملتا ہے جس میں معاشرے کی اونچ نیچ، عوام الناس کے نجی مسائل کے علاوہ سماجی زندگی کی الجھنیں دکھائی دیتی ہیں۔ ان قطعات میں انسان کے کھوکھلے رشتے اور دم توڑتی بھائی چارگی کا عکس شدّت سے ابھرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ اس نہج کے قطعات کے چند نمونے دیکھئے:

ہم تمہارے منتظر تھے، تم ہمارے منتظر — وہ گلے ملنے کے موسم ہل گئے سب خاک میں
اب یہ عالم ہے کسی پنگھٹ، کسی چوپال پر — ہم تمہاری گھات میں ہیں، تم ہماری تاک میں
(سوکھا پنگھٹ)

ہم کو دیکھے تو کون مانے گا — باغ میں بود وباش کرتے ہیں
دوستی ہے گھنے درختوں سے — اور سایہ تلاش کرتے ہیں
(سبز باغ)

خدایاں دریا کا دامن پکڑ کر — کنارے لگے ناخدا کیسے کیسے
جہاں موڑ آیا وہیں ساتھ چھوڑا — ہمارے بھی ہیں رہنما کیسے کیسے
(ہمارے رہنما)

عورت اور اس کی بدحالی شروع سے ہمارے ادب کا موضوع رہا ہے۔ شعری اور نثری دونوں اصناف میں عورت کی زندگی کے حوالے سے ہمارے ادباء وشعراء نے ان کی معاشی، معاشرتی اور ذہنی الجھنوں کو اپنی تخلیقات میں جگہ دی ہے۔ عورت صدیوں سے مرد کی زیادتی کا شکار ہوتی آئی ہے۔ معاشرے میں ان کی اہمیت کبھی مسلم نہ ہوئی۔ اس بات کا احساس اعزاز افضل کو بھی تھا۔ شاید اسی لئے موصوف نئے سال کی خوشیوں میں عورتوں کو شریک نہیں کرتے کہ کوئی بھی سال ان کی عزت وعظمت کی رکھوالی کرنے کے لئے نہیں آتا:

محفوظ کوئی گھر، کوئی تھانہ، کوئی سرائے — شیاما کے واسطے ہے نہ پروین کے لئے
ہر لمحۂ حیات ہے مردوں کا زرخرید — یہ سال بھی نہیں ہے خواتین کے لئے
(خواتین کا سال)

اعزاز افضل اپنے قطعات میں مذہبی رواداری کے علمبردار کے طور پر اُبھرتے ہیں۔ انہوں نے مذہب کو قریب سے نہ صرف سمجھا بلکہ اپنے قلب وجگر سے اسے محسوس بھی کیا تھا۔ ان کے صحافتی قطعات میں اکثر ہمیں مذہب کے قاتلوں پر وار ملتا ہے۔ وہ شیخ وبرہمن، شیعہ وسنّی اور ہندو مسلم کی آپسی رنجش کو بار بار موضوع بناتے ہیں۔ ایسے قطات کے مطالعے سے ان کی انکی وسیع القلبی اور بالغ نظری کا احساس ہوتا ہے۔ شیخ وبرہمن کے جعلی چہرے کو انہوں نے بڑی فنکاری سے اتار کر نوچ پھینکا ہے:

دونوں کی انتہائے سفر منزل فساد — جو شیخ کا وہی ہے برہمن کا راستہ
سڑکوں کی دیکھ بھال سے کیا کام ہے انہیں — ہموار کر رہے ہیں الیکشن کا راستہ
(شیخ وبرہمن)

ہمارے خون نے بخشی ہے کیا توانائی — جو دھان پان تھے کل آج ہٹے کٹّے ہیں
مزاج شیخ وبرہمن میں کوئی فرق نہیں — یہ دونوں ایک ہی تھالی کے چٹّے بٹّے ہیں
(شیخ وبرہمن)

جس نے گروی رکھ دیا زنّار کو — ملک میں ایسا برہمن کون ہے؟
آئینے میں اپنی صورت دیکھئے — آپ سیتا ہیں تو راون کون ہے؟
(میاں مٹھّو)

مذہبی تفریق کو اعزاز افضل نے اپنے قطعات کے ذریعہ ہدفِ تنقید بنایا ہے۔ ''قلم برداشتہ'' میں ایسے بیشتر قطعات مل جاتے ہیں جس میں مذہبی سیاسیت پر طنز کے نشتر چلائے گئے ہیں اور ایک صحت مند قوم کی آس لگائی گئی ہے:

اے کاش! ہم وہ دورِ مساوات دیکھتے — جب غزنوی کی صف میں کھڑا تھا ایاز بھی
کیا ہم خیال ہوں گے یہ ملّت کے ترجمان — اب ایک ساتھ پڑھ نہیں سکتے نماز بھی
(بہتر فریق)

سب کے پیشِ نظر ہے اپنا مفاد — کون ملّت کی دیکھ بھال کرے
ہم بھی بکرے ہیں تم بھی بکرے ہو — جس کا جی چاہے وہ حلال کرے
(قربانی کے بکرے)

صحافتی قطعہ نگار کی نظر اپنے ملک اور اپنی قوم سے بلند وبالاتر ہوتی ہے۔ وہ ذاتی تجربے اور شعور وادراک سے عالمی دنیا پر بھی اپنی نظریں مرکوز رکھتا ہے۔ ایسا شاعر آفاقی جذبے کا حامل ہوتا ہے جو ہر طرح کے مسائل کو شعری پیکر میں ڈھالنے کا ہنر رکھتا ہے۔ اعزاز افضل کے یہاں اپنے ملک کے سیاسی اور سماجی مسائل کے علاوہ بین الاقوامی سیاست، معیشت، جنگ کے اثرات وغیرہ پر اچھے خاصے قطعات موجود ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ موصوف کی نگاہ صرف بنگال یا ہندوستان کی فضا تک محدود نہیں تھی بلکہ ایک عظیم شاعر کی طرح ان کی فکر میں عالمی منظر نامے کی گرتی ہوئی قدریں پوری شدّت کے ساتھ ان کے جذبات واحساسات میں رچ بس گئی تھیں۔ چنانچہ موصوف بوسنیا کے مظلوموں کی بے بسی پر اپنے مخصوص انداز میں کفِ افسوس ملتے ہیں:

کون ان کے زخم دیکھے، کون فریادیں سنے — سامراجی ذہن بہرا بھی ہے نابینا بھی ہے
ہے جہاں مرنا بھی مشکل اور جینا بھی عذاب — بے سہاروں کو وہیں مرنا بھی ہے جینا بھی ہے
(بوسنیا کے مظلوم)

اعزاز افضل کے قطعات کا مطالعہ تصدیق کرتا ہے کہ انہوں نے عالمی دنیا کی تاریخ ایک روزنامچے کی شکل میں لکھ دیا ہے جسے جب بھی پڑھا جائے اس کی یاد تازہ ہوتی رہتی ہیں۔'بغداد پر حملہ'، 'کراچی کے مظلوم'، 'ازلی دشمنی' اور 'جگت دادا' وغیرہ جیسے قطعات ان کی عالمی سیاست پر گہری نظر کی بہترین مثالیں ہیں۔اس نہج کے قطعات میں ان کے یہاں انسان دوستی اور اخلاقی بھائی چارگی کا عمل دخل نظر آتا ہے۔ایسا اس لئے کہ ایک شاعر کبھی درسِ اخلاق کا خون نہیں کرتا بلکہ وہ اپنی شاعری کے زریعہ اقوام اور لوگوں کے درمیان تال میل پیدا کر کے اس میں اُخوت ومحبت کا رنگ بھرتا ہے۔اعزاز افضل کے قطعات میں یہ خوبی بدرجہ اتم موجود ہے۔اخلاقی بھائی چارگی اور انسان دوستی کے حوالے سے ان کے دو قطعات ملاحظہ ہوں:

آج کے انسان کو ہے امن گاہوں کی تلاش — زندگی کی منزلِ مقصود اب مقتل نہیں
دشمنوں پر فتح پانے کا ہنر کچھ اور ہے — جنگ تو خود مسئلہ ہے ،مسئلے کا حل نہیں
(جیت کا ہنر)

حسد کی تیغ سے بہتر ہے بیٹ سدّھو کا — ستم کی چھوٹ سے اظہر کا کیچ اچھا ہے
وکٹ گرا نہ سکی مذہبی جنون کی گیند — سیاسی کھیل سے کرکٹ کا میچ اچھا ہے
(کرکٹ میچ)

اعزاز افضل کا مشاہدہ بہت تیز اور بات نپی تلی ہے۔انہوں نے تہذیب وثقافت کا خون ہوتے ہوئے دیکھا تھا اسلئے ان کے صحافتی قطعات کے مطالعے سے اس بات کا احساس بھی ہوتا ہے کہ وہ تہذیبی گراوٹ کو مثبت انداز میں نہ صرف محسوس کرتے ہیں بلکہ اس کا برملا اظہار بھی ہمیں ان کے یہاں دیکھنے کو مل جاتا ہے۔اس ضمن میں موصوف کے 'جشن حقوق' اور 'بارود کے ڈھیر' جیسے قطعات پیش کئے جاسکتے ہیں:

ہم مذہبی جنون کو مذہب کا نام دیں — ایسے فریب خوردۂ جذبات بھی نہیں
جمہوریت کے دم سے ہے، جتنے حقوق ہیں — جمہوریت نہیں تو مراعات بھی نہیں
(جشنِ حقوق)

غریبوں کا مسکن، غریبوں کا مامن — کراچی، نہ دہلی، نہ کابل نہ ڈھاکہ
لسانی تشدّد ،گروہی تصادم — سماجی سرنگیں، سیاسی دھماکہ
(بارود کے ڈھیر)

ان موضوعات کے علاوہ اعزاز افضل نے ملک کے بجٹ کے اثرات، کرکٹ میچ، مغرب کا تہذیبی بحران، وطن پرستی، بنگال اور کلکتے کی سیاسی فضا، بم دھماکہ، اخبار نویسوں کی قلم فروشی، سارک کانفرنس، کشمیر کا مسئلہ، دہلی کے بنگالیوں کی حالتِ زار، ممبئی کا بم دھماکہ، صدر راج کے اثرات، سیاسی پارٹیوں کی چالیں، طیّاروں کا ہائی جیک، ادیبوں کی کرداری گراوٹ، طلبا کا درد، قوم پرستی کا ماتم، پولیس کی مکاری، پنچایت الیکشن کے اثرات، دہشت گردی، ملک کی معیشت، ماحولیاتی آلودگی، غریبوں کی بھوک مری، رشوت خوری، ووٹ کے داؤ پیچ، ہتھیاروں کا کھلے عام لین دین، سیاست دانوں کی گھپلے بازی، کارپوریشن کی بدحالی، دفاتر کی کام چوری، شہروں کی بدحالی، قوم فروشی، مفلسوں کی لاچاری وغیرہ جیسے موضوعات کو قطعات میں خوس اسلوبی سے سمو دیا ہے۔ انہوں نے ہمیشہ ملک وقوم کے درد کو سہا اور ظلم وستم کے خلاف لکھا۔

اعزاز افضل کے صحافتی قطعات کا ڈکشن عوام سے بہت قریب تر ہے۔ان کے قطعات میں امکانات کی ایک دنیا آباد ہے۔وہ صحافتی قطعہ کے مخصوص دائرہ کار میں رہ کر حقائق کی ترسیل کرتے ہیں۔معاشرے کے ناسوروں پر انہوں نے جس خوس اسلوبی سے قدغن لگائے ہیں اس کی مثال اردو کے صحافتی قطعہ نگاری میں بہت کم دیکھنے کو ملتی ہے۔ ان کے قطعات میں عام قطعہ کی طرح لفاظی اور صناعی کا عمل دخل نہیں ہے۔انہوں نے عام فہم الفاظ، سادگی اور برجستگی پر زور دیا ہے۔صحافتی قطعات میں چونکہ باطنی جذبات کا عمل دخل بہت کم ہوتا ہے تاہم اچھے قطعہ نگار اس میں بھی اپنا مافی الضمیر بیان کر کے اسے لطافت اور ترفع عطا کرتے ہیں۔اعزاز افضل کے قطعات میں یہ خوبی بعض قطعات میں دیکھنے کو ملتی ہے۔انہوں نے حقائق کی ترسیل میں تخیل سے حتی الامکاں گریز کیا ہے لیکن صحافتی قطعات کے شعری محاسن کو ترسیل کے لئے قربان نہیں کیا۔ان کا مشاہدہ تیز، بیان میں اختصار اور برجستگی نمایاں ہے۔ان کے قطعات میں طنز کا پہلو اور مزاح کا عنصر بھی موجود ہے جو صحافتی قطعہ کے لئے نہ صرف چاشنی کا کام کرتے ہیں بلکہ شاعر ان قطعات کے ذریعہ عوام تک اپنی بات پر لطف انداز میں پہنچاتا ہے۔موصوف کے بیشتر قطعات ادیبانہ شان وشوکت کے حامل اور زبان وبیان کی جملہ خوبیوں سے متصف ہیں۔ان قطعات میں تشبیہات واستعارات کے علاوہ علامت نگاری کا استعمال اور شعری پیکر میں محاورے اور ضرب المثل کی آمیزش بھی بڑی فنکاری سے ملتی ہے جس کے مطالعے کے بعد قاری کو غیر مانوس فضا کا احساس نہیں ہوتا۔ان جملہ خوبیوں کی بنا پر ہم اعزاز افضل کو بنگال کی صحافتی قطعہ نگاری کا امام کہہ سکتے ہیں کہ ان کے قطعات میں صحافت اور قطعات کی فنّی خوبیاں دونوں عروج پر نظر آتی ہیں۔

☆☆☆

دہلی میں ماہنامہ آجکل کے فروخت مراکز

بُک گیلری، پبلی کیشنز ڈویژن

سوچنا بھون، سی جی او کمپلیکس، لودھی روڈ، نئی دہلی۔110003

پبلی کیشنز ڈویژن ، ہال نمبر196

اولڈ سکریٹریٹ۔دہلی۔110054 فون:011-23890205

ایم ایل اینڈ سنس

شیواجی اسٹیڈیم کمپلیکس، بھگت سنگھ مارگ، نئی دہلی۔110001

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

اردو بازار، جامع مسجد، دہلی۔110006 فون:011-23260668

شمسی بک ڈپو

بٹلہ ہاؤس، جامعہ نگر، نئی دہلی۔110025

ظہیر الدین نیوز پیپر ایجنٹ

نزد غالب اکیڈمی بستی حضرت نظام الدین، نئی دہلی۔110013

فون:09818593958

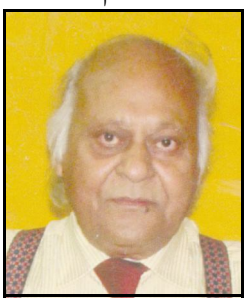
بھیشم ساہنی



پالی

(بٹوارے کی ایک دردناک داستان)

ترجمہ: شمیم فاروقی



بات کبھی بھی ختم نہیں ہوتی۔ زندگی کے کنارے کسی ایک دوسرے سے نہیں ملتے، نہ زندگی میں، نہ قصے کہانیوں میں۔ ہم صرف اس امید میں جیتے رہتے ہیں کہ ایک دن وہ مل پائیں گے اور کبھی کبھی ہمیں ایسا بھرم ہونے لگتا ہے کہ وہ سچ مچ مل گئے ہیں۔

منوہر لال اور اس کے خاندان کی زندگی کا ایک کنارہ تو کہیں دور پرے کے ایک قصبے میں اس وقت رہ گیا تھا جب دیش کا بٹوارہ ہوا تھا اور سیکڑوں لوگوں کے ساتھ وہ بھی اپنا بوریا بستر اٹھائے شرنارتھیوں کے قافلے میں چلنے لگے تھے۔ شرنارتھیوں کے قافلے کبھی ایک بٹوارے کی لکیر کی طرف بڑھنے لگے تھے جو انہی دنوں ایک دیش کو کاٹ کر دو دیش بنانے کی لکیر کھینچ دی گئی تھی.....!

منوہر لال، اس کی بیوی اور دو بچے۔ چھوٹی بچی تب ماں کی گود میں تھی اور بڑا چار سال کا پالی، قافلہ میں باپ کے پیچھے پیچھے چلا جا رہا تھا۔ اپنے اپنے گھر، پوٹلیاں اٹھائے پریشان، پھٹی پھٹی آنکھوں سے راستہ کھوج رہی تھیں۔ ہر شرنارتھی کے کان ہر راہ آتے جاتے کی باتوں پر لگے ہوئے تھے کہ شاید کوئی اتنا ہی بتا دے کہ چاروں طرف کیا ہو رہا ہے اور آگے کیا ہوگا۔ منزل کا کسی کو کوئی گمان نہ تھا۔

اور آخری دن بڑے شہر کا شرنارتھی کیمپ خالی ہونے لگا تھا۔ اور شرنارتھی پھر سے اپنے گھر، پوٹلیاں اٹھائے شہر کے باہر نکل رہے تھے۔ سڑک پر ایک کے پیچھے ایک، بہت سی لاریوں کی قطار کھڑی انہیں تقسیم کی لائن تک لے جانے کے لیے تیار تھیں۔ منوہر لال بھی سر پر گٹھر رکھے لاریوں کی طرف بڑھ رہا تھا۔ تباہ حال دیگر شرنارتھی اپنے اپنے گٹھر اور صندوقچیاں لاریوں میں پھینک رہے تھے اور اچھل اچھل کر چڑھنے لگے تھے۔ تب منوہر لال کو لگا کہ اس کے بیٹے، پالی کا ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا ہے۔ اسی وقت تک کوشلیا لاری پر چڑھ چکی تھی اور منوہر لال نے گٹھر سر پر سے اتار کر اسے پکڑا دیا تھا۔ تب ہی اس نے دیکھا پالی وہاں پر نہیں تھا۔ پر منوہر لال کو اس وقت زیادہ فکر نہیں ہوئی اس نے سمجھا یہیں کہیں ہوگا۔ بچے کے ہاتھ کی گرماہٹ ابھی ابھی اس کی ہتھیلی میں موجود تھی۔ چاروں طرف شور ہی شور تھا اور بھیڑ ہی بھیڑ۔ کیمپوں کے نگراں چودھری لوگ چلّا رہے تھے کہ جلدی جلدی لاریوں پر سوار ہو جاؤ، دن ڈھلنے سے پہلے ہمیں سرحد پار کر لینی ہے۔ لاریوں کے ڈرائیور بھونپو بجا رہے تھے۔ شرنارتھی ایک دوسرے پر چلّا رہے تھے۔ پر جب اِدھر اُدھر دیکھنے پر بھی پالی کہیں نظر نہیں آیا تو اسے فکر ہوئی اور ''پالی۔ پالی'' چلاتا ہوا پیچھے کی طرف دوڑا پر کہیں سے کوئی جواب نہ آیا۔ سڑک پر لاریاں چھوٹتی جا رہی تھیں اور جس لاری میں اس کی بیوی اپنی دودھ پیتی بچی کو لے کر کھڑی تھی وہ بھی کھچا کھچ بھر گئی تھی اور اس لاری کا بھونپو بار بار بج رہا تھا۔

''پالی۔ پالی'' چلاتے ہوئے منوہر لال کا گلا خشک ہونے لگا تھا۔ ٹانگیں کانپنے لگی تھیں اور سر چکرانے لگا تھا۔ بھیڑ سے بھری سڑک پر منوہر لال چلائے جا رہا تھا۔ ابھی اس کی ہراساں نگاہیں بچہ کو تلاش کرنے میں ادھر ادھر بھٹک رہی تھیں کہ لاری سرکنے لگی تھی۔

اس کی پریشان بیوی جس کی آنکھیں بھیڑ میں اپنے شوہر پر لگی تھی اب وہ بھی بھیڑ میں کہیں گم ہو گیا تھا۔ پریشانی کے عالم میں رونے چلانے لگی۔ الجھے بالوں کی خاک میں لپٹی لٹیں چہرے پر بکھر گئیں۔ دودھ پیتی بچی گود میں تڑپتی بلکتی ماں کی چھاتی میں زور زور سے رو رہی تھی۔ سانس پھولا ہوا دھونکنی کی طرح چلتا ہوا۔

''روکو۔ روکو۔ لاری، ہائے روکو لاری۔''

پر وہاں سنتا کون تھا۔ سارے اپنی جگہ چلا رہے تھے۔ کوئی کسی بات پر۔ کوئی کسی پریشانی پر۔ اکیلا اس ہی کا خاندان تو گھر نہیں چھوڑ رہا تھا۔ کسی کا آدھا سامان لاری پر چڑھایا جا چکا تھا اور کھاٹ کھٹولے ابھی بھی سڑک پر بکھرے پڑے تھے۔ کسی کی بوڑھی ماں لاری پر نہیں چڑھ پا رہی تھی۔ دھکے پر دھکا پڑ رہا تھا۔ گاڑی سرک رہی تھی۔ کوشلیا کی پھٹی پھٹی آنکھیں اپنے شوہر کو تلاش کر رہی تھیں۔ پھر جب کوشلیا دھاڑ مار مار کر رونے لگی جیسے کوئی پرندہ اپنا گھونسلہ اجڑ جانے پر چیختا ہے۔ تب کسی کے کانوں میں اس کی تڑپتی آواز پڑی اور لاری میں کسی کی آواز بلند ہوئی۔ ''لاری روکو۔ لاری روکو۔'' پھر دو ایک اور بھی چلائے تب کہیں جا کر لاری روکی گئی۔ کوشلیا نے ایک گٹھری تو نیچے پھینک دی تھی اور روتے بلکتے اپنی گود کی بچی کو بھی سڑک پر کھڑے شرنارتھیوں کے ہاتھوں میں دینے جا رہی تھی۔ تب ہی ادھر سے منوہر لال بھاگتا ہوا لوٹ آیا تھا۔ بیٹا اس کے ساتھ نہ تھا۔ نہ جانے کس بھنور نے پالی کو نگل لیا تھا۔

کچھ آوازیں منوہر لال کو مخاطب کرتے ہوئے دلاسہ دے رہی تھیں۔

''بچہ، یہیں کہیں ہوگا۔'' ''تم لاری میں آ جاؤ۔'' کسی دوسری لاری میں چڑھ گیا ہوگا۔ تم صبر رکھو۔ مل جائے گا۔۔ کچھ آوازوں میں غصہ اور جھنجھلاہٹ صاف محسوس کی جا سکتی تھی۔ ''تمہارے ایک بچے کے خاطر گاڑی کھڑی رہے گی کیا؟ اگر بچہ تلاش کرنا ہے تو لاری سے اتر جاؤ۔ کئی

امر پالی لیزر ویلی، ولا نمبر A-291، ٹیک زون IV، گریٹر نوئیڈا ویسٹ۔ فون: 9899960618

نظریں بدل چکی تھیں۔ اگر منوہر لال بھاگتا ہوا نہیں آتا تو کوشلیا روتی، بلکتی لاری سے اتر گئی ہوتی۔ میاں بیوی فیصلہ نہیں کر پا رہے تھے کہ وہ لاری میں بیٹھے رہیں یا اتر جائیں۔ پالی کا کوئی پتہ نہیں چل رہا تھا۔ دور دور آنکھیں دیکھ کر واپس اپنی جگہ آجاتی تھیں۔ منوہر لال اور کوشلیا آنکھیں پھاڑے سڑک کی طرف ہی دیکھے جا رہے تھے۔ لاری دھیرے دھیرے آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ لوگوں کا زور شور کم ہوتا جا رہا تھا۔ صرف کوشلیا ابھی بھی سبک سبک کر روئے جا رہی تھی۔ پھر پیڑ، کھیت اور ہرے بھرے میدان آنکھوں کے سامنے تیزی سے گزرنے لگے۔ شہر کی بھیڑ میں کھویا پالی دور ہوتا چلا گیا۔

دھیرے دھیرے آسمان پر سائے لہرانے لگے۔ کہیں کہیں تارے جھلملانے لگے اور اندھیرا گہرا ہوتا گیا تو منوہر لال اپنی بیوی کی ڈھارس باندھنے لگا۔ ''مل جائے گا، مل جائے گا۔ یہی کہیں ہوگا۔ کسی بھلے انسان نے ضرور اسے کسی دوسری لاری میں بٹھا دیا ہوگا۔'' کوشلیا کی پتھرائی آنکھوں کو اور چہرے پر چھائی مردنی دیکھ کر بولا۔ ''نہیں ملا تو اب کیا کریں۔'' ہمارا تو پھر بھی بھگوان کی کرپا سے ایک بچہ بچ رہا ہے۔ لیکھ راج کے تو تینوں بچے اس کی آنکھوں کے سامنے فسادیوں نے مار ڈالے تھے۔ بھگوان کو جو منظور ہوگا، وہی ہوگا۔ ہم کیا کر سکتے ہیں۔''

ایک چھوٹے بچے کا گم ہو جانا کون سی بڑی بات تھی۔ اس پر اتنا واویلا مچانا کیا تک۔ قافلے والے بھلا کیوں پریشان ہوں۔ قافلے میں شامل شرنارتھی دھیرے دھیرے ایک دوسرے سے باتیں کرنے لگے۔ عورتوں کی بات چیت میں بدستور اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ کوشلیا کی آنکھیں بھی خاموش تھیں اور ہونٹ بھی خشک مرجھائے ہوئے۔

سرحد تک پہنچتے پہنچتے اندھیرا پھیل گیا تھا۔ جب ایک جگہ لاریاں رکیں تو منوہر لال لاری سے کود کر سڑک پر آ گیا تھا اور ''پالی۔ پالی'' چلاتے ہوئے سب لاریوں کے سامنے سے گزرتا دھاڑیں مار رہا تھا۔ ایک ایک لاری میں جھانک جھانک کر دیکھا۔ پر کہیں سے کوئی جواب نہ ملا۔ پالی لاپتہ تھا۔

سرحد پر پہنچ کر شرنارتھی لاریوں میں سے اتر اتر کر دوسری کھڑی لاریوں میں بیٹھنے لگے تھے اور لاریاں رات کے خاموش اندھیروں میں امرتسر کی جانب بڑھنے لگی تھیں۔ تاروں کا جال پہنے آسمان بہت پراسرار لگ رہا تھا۔ شرنارتھی خاموش تھے۔ ہچکولے کھاتی لاریوں کے بیچ کچھ لوگ اونگھنے لگے تھے۔ چہروں پر خاموش اداسی چھائی تھی۔ لیکن منوہر لال کی بیوی اچانک چیخنے چلانے لگی مانو کوئی دورہ پڑ گیا۔ منہ سے جھاگ نکل رہے تھے۔ لاری میں بیٹھے لوگ سہم گئے تھے کہیں عورت پاگل تو نہیں ہوگئی۔ کچھ دیر چلانے، پچھاڑ کھانے کے بعد آہستہ آہستہ سسکنے لگی۔ سسکیاں لیتے لیتے آخر کار وہ اپنے شوہر کے کاندھے پر سر رکھ کر سو گئی تھی۔ لوگوں کو تسلی ہوئی کہ عورت اس صدمہ سے پاگل ہونے سے بچ گئی۔ منوہر لال نے دل ہی دل میں فیصلہ کیا کہ اگر پالی سچ مچ نہیں ملا تو کسی بھی طرح وہ کوشش کر کے اس کا کچھ اتہ پتہ لگائے گا۔ وہ اپنے بچے کو ڈھونڈے گا ضرور چاہے اسے واپس جانا پڑے۔

ہندوستان کی طرف بڑھتا ہوا لاریوں کا قافلہ اندھیروں میں آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ آگے کیا ہوگا، اس بارے میں کسی کی سوچ کام نہیں کر رہی تھی، دماغ نے کام کرنا بند کر دیا تھا۔ سب بس ہچکولے کھاتی لاریوں میں تھکان، پھٹی پھٹی آنکھوں، سوکھے ہونٹ، خشک گلے کے عالم میں ان گنت تاروں کا خاموش، اداس، رنجیدہ ماحول میں سفر کر رہے تھے۔

شکورا حمد چینی کے برتنوں کو سر پر اٹھائے گلی گلی، محلّہ محلّہ پھر کر اپنا سامان بیچ کر اپنا اور اپنی بیوی زینب کا گزارا کر لیا کرتا تھا۔ ہاتھ میں پتلی سی چھڑی لیے سر پر برتنوں کا ٹوکرا لیے وہ دن بھر پورے قصبے میں آواز لگاتا پھرتا رہتا۔ ساری سڑکیں، ساری گلیاں، سارے راستے، اس کے دوست تھے۔ سب راستے اسے پہچانتے تھے اور وہ ان راستوں سے ایسے گزر جاتا جیسے وہ سب اس کے حسین ساتھی ہوں۔ ایسے ہی ایک دوپہر میں جب وہ ہانک لگا کر برتن بیچ رہا تھا تو اس ڈھلتی دوپہر میں ہجرت کر کے جانے والوں کی بھیڑ میں سے پھینکا ہوا ایک بچہ ایک گلی کے کنارے روتا بلکتا۔ ماتا جی۔ ماتا جی۔ پتا جی۔ پتا جی چلاتے ہوئے نظر آیا۔ جب شکور کی نظریں اس پر پڑیں تو وہ سہم اور ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا۔ شکور اس کے پاس بیٹھ کر اسے چمکارنے، دلارنے اور اس کے آنسو پونچھنے لگا تھا اور جب اس کو لگا کہ پچکارنے سے بچے کی سسکیاں تھمنے لگی ہیں تو اس نے دلاسہ دیتے ہوئے کہا۔ ''گھبرا نہیں۔ تو میرے ساتھ چل، میں تمہارے ماتا پتا کے کے پاس چھوڑ آتا ہوں۔'' یہ کہہ کر اس کا ہاتھ تھامے وہ آہستہ آہستہ اپنے ساتھ لے چلا تھا۔ پہلے وہ اس مقام کی طرف گیا جہاں سے لاریاں روانہ ہوئی تھیں۔ اس وقت تک اڑتی خاک دھول بھی بہت حد تک بیٹھ چکی تھی۔ ادھر شرنارتھیوں کے کیمپ بھی خالی پڑے تھے۔ چند لوگ ٹوٹے پھوٹے ادھر ادھر بکھرے پڑے تھے۔ کسی نے ان کی طرف متوجہ ہونے کی ضرورت نہ سمجھی۔ رات کے اندھیرے میں جب شکور نے تھک ہار کر اپنے ٹوٹے پھوٹے گھر کی ڈیوڑھی میں قدم رکھا تھا تو اس کے کندھے سے لگ کر بچہ سو چکا تھا۔ ساس نے ساری کہانی زینب کو سنائی اور بچہ اس کی گود میں ڈال دیا۔

شکور خدا ترس آدمی تھا۔ زندگی کو ڈر ڈر کر جینے والا۔ جب سے خونی دنگے شروع ہونے لگے تھے وہ ان سے کنارہ کشی کیے جا رہا تھا۔ ہر شر شرابے اور لڑائی سے دور رہتا تھا۔ جب شہر کی بڑی منڈی میں بھی آگ لگ گئی اور شہر کی گلیوں میں بھی اکا دکا آدمی مارے جانے لگے وہ بڑبڑاتا ہوا یہ ہی کہتا۔ ''خدا کا قہر ٹوٹا ہے شہر پر۔''

''سب ہندو۔ سکھ گھر بار چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔ کیمپ خالی ہو گیا ہے۔ اب ادھر کوئی نہیں آئے گا۔'' شکور بڑبڑاتے ہوئے سونے کی کوشش کرنے لگا۔ زینب نے شکور کے بڑبڑانے پر کچھ نہیں بولا۔ خاموشی سے پڑی رہی۔ بچہ نیند میں کسمسایا تھا، گہری سانس لی اور زینب کی چھاتی پر اپنا ہاتھ رکھتے ہی گہری نیند میں سو گیا تھا۔ وہ اس کیفیت میں کچھ بولنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ لیکن اس نے اسی افسردہ آواز میں شکور سے کہا۔ ''چھوڑ آؤ اس بچے کو وہیں جہاں سے لے کر آئے ہو۔ کسی بدنصیب کی آہ ہمیں کیوں لگے؟''

''ہمیں کیوں، کیوں کسی کی آہ لگے گی؟ ہم تو پناہ دے رہے ہیں۔'' شکور بڑبڑایا۔ ''تھانہ میں دیا تو وہ کون سا اس کے ماں باپ کے پاس تھوڑے ہی لے جائیں گے۔'' دونوں ایک دوسرے کا دل ٹوہ رہے تھے۔ اپنے گال سے بچے کا ماتھا سہلاتے ہوئے زینب نے پھسپھسی آواز میں کہا۔ ''اس کا نام کیا ہے''؟

''میں کیا جانوں؟ میں نے پوچھا تو پالی۔ پالی بول رہا تھا۔''

''ہندوؤں کے نام کتنے اٹ پٹے ہوتے ہیں۔ بھلا پالی بھی کوئی نام ہے۔ میں تو اپنے بیٹے کا نام الطاف رکھتی۔''

دونوں دیر تک چپ چاپ لیٹے رہے۔ زینب اپنے خیالوں میں ڈوب گئی تھی، جب کہ شکور طرح طرح کی سوچوں میں گم تھا۔ کسی نے پوچھا تو چھ نہیں کی تو زینب

کی گود ہری ہوجائے گی۔ آنگن میں خوشیاں کھیلیں گی۔ اب پوچھ تاچھ کرنے کوئی نہیں آئے گا۔ محمود درزی نے تو ہندوانی گھر میں بیٹھالی ہے۔ میرزمانی نے اپنے ہمسائے راج کشن کی پوری دکان کا سامان اٹھا کر اپنے گھر میں بھر لیا ہے۔ شکور کو یقین ہو چلا تھا کہ دو چار دن کے بعد بچہ گھر پہچان لے گا۔

زینب کا پیار اس کی نرم گود بچے کے دل میں ہماری محبت بھر دے گا۔ اس کا دل بہل جائے گا لیکن دل میں یقین نہیں تھا۔ کیا معلوم اس کے ماں باپ یہیں کہیں بھٹکتے پھر رہے ہوں۔ کہیں ڈھونڈتے پھرتے اس کے گھر تک نہ پہنچ جائیں۔ سارے شرنارتھی ابھی تک گئے بھی تو نہیں ہیں۔ کیا معلوم پولیس تھانے والوں کو پتہ چل جائے۔ کہیں لینے کے دینے نہ پڑ جائیں۔

دو چار دن تو جیسے تیسے گزر گئے۔ ایک ہفتہ میں بچہ کچھ کچھ ہنسنے کھیلنے لگا۔ ایک سفید بلی جو کہیں سے آ کر آنگن کی دیوار پر بیٹھی تو اسے دیکھ کر بچہ کھِل اٹھا۔ بلّی۔ بلّی کہہ کر اس کی طرف بھاگنے لگا۔ شکور زینب کے بے جان چہروں پر جان آ گئی۔ تب ہی دروازے کو کسی نے زور سے کھٹکھٹایا۔ میاں بیوی دونوں چونک گئے۔ دونوں کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ شاید وہی لوگ پہنچ گئے ہیں جن کا بچہ ہے۔ کہیں تھانے والے نہ ہوں۔ اسی الجھن میں وہ دروازے کے قریب جانے کے لیے اٹھا۔ پھر دستک سنائی دی۔ ایسا لگا کوئی لاٹھی سے دروازہ پیٹ رہا ہو۔ ''کھولو دروازہ۔'' باہر سے آواز آئی۔ ''کھول دو جی۔'' زینب نے کہا اور اٹھ کر بچے کو لے کر کوٹھری میں چلی گئی۔ دروازے کے پیچھے پولیس کا سپاہی نہیں تھا۔ بچے کے ماں باپ بھی نہیں تھے۔ موٹا سا لٹھ اٹھائے ایک داڑھی والے مولوی صاحب کھڑے تھے ان کے ساتھ دو بھدّے سے آدمی بھی لٹھ ہاتھوں میں لیے اور بھی تھے۔

''کافر کا بچہ یہاں کون لایا ہے؟'' کوئی اور کافر بھی گھر کے اندر چھپا رکھا ہے کیا؟'' مولانا دہاڑتے ہوئے صحن میں آ گئے۔ شکور بھاگ کر مونڈھا اٹھا لایا۔ ''قسم خدا کی ہم نے کسی کو نہیں چھپا رکھا ہے۔ ہم نے تو صرف ایک یتیم بچے کو پناہ دی ہے۔'' اتنے میں زینب خود بچے کو لے کر باہر صحن میں آ گئی۔ مولانا نے شک بھری نظروں سے شکور کے چہرے کی طرف دیکھا، پھر زور سے فرش کو لاٹھی سے پیٹتے ہوئے بولا۔ ''کافر کی اولاد کو پناہ دے رہی ہو؟''

''بچے کو گود ہی لیا ہے۔ کوئی گناہ نہیں کیا ہے مولوی صاحب۔'' زینب نے پر اعتماد لہجے میں جواب دیا۔ مولانا غرایا۔ ''کیا سنتیں کروائی ہیں؟ کلمہ پڑھوایا ہے؟ زینب کی جان میں جان آئی کہ مولوی بچے کو چھیننے نہیں آیا۔ وہ تو اسے مسلمان بنانے آیا تھا۔ پر وہ خاموش ہی بنی رہی۔

''بولتی کیوں نہیں؟ کافر کی ناپاک اولاد کو گود میں لیے بیٹھی ہو۔ کیا سانپ پالنے لگی ہو؟'' وہ کچھ بولنے ہی والی تھی کہ مولوی صاحب نے اپنا لٹھ زور سے زمین پر مارتے ہوئے فرمان جاری کیا کہ کل اسے لے کر مسجد میں آؤ۔ اسے مسلمان بنانے کی رسم ادا کی جائے گی۔

دوسرے ہی دن بچہ کو ہندو سے مسلمان بنا دیا گیا۔ کلمہ پڑھایا گیا، سنتیں ہوئیں۔ نشتر دیکھ کر ننھا پال ڈرا۔ چلایا۔ خوف کے مارے زینب کی ٹانگوں سے چمٹا رہا۔ وہ رو رہا تھا، بلک رہا تھا۔ درد کے مارے بے حال ہو گیا۔ مولوی کو بھی اس پر ترس آ گیا۔ اس کو اس طرح چیخ چیخ کر پتا جی کو یاد کرنا بھی مولوی کو نا گوار نہ گزرا۔ بلکہ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔ آس پڑوس کے لوگ شکور۔ زینب کو مبارکباد دے رہے تھے۔ مولوی بھی لڑکے کے لیے پھندنے والی لال ٹوپی لے آیا تھا۔ مولوی نے بچہ کو اٹھا کر پیار کیا پھر زینب کی گود میں دیتے ہوئے بولا۔ ''اب یہ تیرا بچہ ہے۔ کسی کافر کا نہیں ہے۔''

دھیرے دھیرے بچہ اپنی نئی شناخت کے ساتھ پہچانا جانے لگا۔ سال بھر کے اندر ننھا پالی، الطاف ولد شکور احمد بن کر ماں باپ کے دل کا قرار بن گیا۔ گھر کے آنگن میں باپ کی طرح ہی برتن بیچنے کی نقل کرتا۔ نماز کے وقت پر نماز پڑھنے کھڑا ہو جاتا۔ رمضان کے روزے کے دنوں میں دیوار پر چڑھ کر ٹین کا خالی کنستر بجا بجا کر زور زور سے آواز لگاتا۔ افطار کا وقت ہو گیا ہے۔ روزہ دار روزہ کھول لو۔ پڑھنے میں اس کی دلچسپی دیکھ کر شکور نے اسے مسجد والے اسکول میں داخل بھی کرا دیا۔ زینب اور شکور کو اپنی زندگی کا مقصد مل گیا تھا۔ میاں بیوی اس کے مستقبل کے لیے خواب الطاف کے ارد گرد گھومنے لگے۔ گھوم گھوم کر برتن بیچنے والا شکور اس دن کے سہانے دن دیکھنے لگا جب وہ چینی کے برتنوں کی اپنی دکان کھولے گا۔ باپ بیٹا دونوں اس میں بیٹھے دکانداری کریں گے۔ دکاندار کہلائے جائیں گے۔ اپنی نیند سوئیں گے اپنی نیند جاگیں گے۔ زینب اس دن کے خواب دیکھنے لگی جب الطاف کی بہو چم چم کرتی اس کے آنگن میں آئے گی۔ آنگن میں اجالا ہی اجالا پھیل جائے گا۔

ایک دو سال اسی مستی میں گزر گئے۔

ایک دن شکور گھر پر نہیں تھا۔ الطاف بھی مدرسے میں تھا۔ اکیلی زینب آنگن میں ٹاٹ کے پردے کے پیچھے بیٹھی چکی پیس رہی تھی جب دروازے پر دستک ہوئی۔ زینب نے بیٹھے بیٹھے ہی جواب دیا۔ ''مرد گھر پر نہیں ہیں۔ شام کو آنا۔'' دروازے کے باہر تھوڑی دیر خاموشی رہی۔ پھر کسی کی آواز آئی۔ ''شکور کے نام سمن ہے۔ تھانے بلایا ہے۔'' ضروری کام ہے۔ ہندوستان سے کسی گم شدہ بچے کے بارے میں تحقیقاتی چٹھی آئی ہے۔ ضرور آ جائے۔ بھولنا نہیں۔ اور پردے کے پیچھے واپس لوٹتے قدموں کی آواز آئی۔ زینب خوف کے مارے سوکھی ڈال کے مانند پاس پڑی کھاٹ پر گر پڑی۔

کچھ صدمے ایسے ہوتے ہیں جو دل کو زخمی کرتے ہیں اور وقت گزرنے پر زخم بھر جاتے ہیں۔ پر کچھ صدمے ایسے ہوتے ہیں جو جونک بن کر اندر سے کلیجہ چاٹنے لگتے ہیں اور انسان کے بس میں کچھ نہیں رہ جاتا۔ کوشلیا جب اپنے شوہر کے ساتھ ہندوستان پہنچی تو اس کی گود خالی تھی۔ اس روز لاریوں کا قافلہ اگر صحیح سلامت سرحد پار کر گیا ہوتا اور منوہر لال، کوشلیا بھی اپنی بچی کے ساتھ صحیح سلامت سرحد پار کر گئے ہوتے تو شاید دھیرے دھیرے پالی کی یاد پر وقت کی دھول پڑنے لگتی اور بچھڑ جانے کا غم ماند پڑ جاتا۔ پر ایسا نہیں ہوا۔ شہر سے نکل آنے کے بعد سرحد آنے سے کچھ دیر قبل ہی جب لاریوں کے قافلے کی آخری دو تین گاڑیوں پر بلوائیوں نے اچانک حملہ کر دیا جو اندھیرے میں آس پاس کے کھیتوں سے نکل آئے تھے۔ ہاتھوں میں نیزے، بھالے، ہونٹوں پر گالیاں اور غصہ سے وہی چیخ پکار جو منوہر لال اور کوشلیا اپنے گاؤں سے نکلتے وقت بھگت چکے تھے۔ لاریاں روکیں گئیں، توڑ پھوڑ ہوگئی۔ کوشلیا دھکے مکی کے سبب گاڑی سے نیچے گر پڑی۔ بچی ہاتھوں سے چھوٹ کر نہ جانے کس فسادی کے نیزے میں آ گئی اسے کچھ پتہ نہ چلا۔ لاکھ کوشش کے باوجود کھڑی نہ ہو سکی اس کے کانوں میں منوہر لال کی آواز گونجتی رہی تھی۔ لا۔ لا۔ بچی کو مجھے دے دے۔ پھر پیچھے سے دھکا لگا اور وہ وہیں اوندھے منہ زمین پر گر پڑی۔

دہلی پہنچنے پر منوہر لال کو لگنے لگا جیسے وہ ابھی بھی لاشوں کے کسی ڈھیر کے نیچے دبا پڑا ہے اور اس کا دم گھٹ رہا ہے۔ وہ اس ڈھیر کے نیچے سے نکل پانے کے لیے

تڑپ رہا ہے۔اس نے محسوس کرلیا کہ اگر وہ اس بوجھ سے نکل نہیں پائے گا تو کچلا جائے گا۔اپنی بیوی اور اپنے کو زندہ رکھنے کے لیے اسے کچھ کرنا پڑے گا۔وہ اکیلا شرنارتھی نہیں ہے اس جیسے لاکھوں شرنارتھی دہلی کے مختلف محلوں،گلیوں اور بازاروں میں کوئی آسرا،کوئی سہارا تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔جو کچھ گزر گیا اس کی طرف سے منہ موڑنا ہوگا۔دو وقت کی روٹی کا جگاڑ کرنا ہوگا،ہزاروں، لاکھوں لوگوں پر قیامت گزری ہے۔کسی نہ کسی طرح وہ ٹھیلا لے کر ایک بازار میں اپنی دکان چلانے لگا۔پر جب وہ دن بھر خاک چھاننے کے بعد گھر لوٹتا اور اس کی نیم پاگل، حواس باختہ بیوی بیٹھی ملتی یا رات کو سوتے سوتے کراہنے یا چیخنے چلانے لگتی تو اس کے صبر کا پیمانہ ٹوٹ جاتا۔وہ کوشلیا کو لاکھ قابو میں رکھنے کی کوشش کرتا۔اسے سمجھاتا کہ وہ روزانہ دفتروں میں جاتا ہے۔سرکاری افسروں سے ملاقات کرتا ہے۔سرکار نے شرنارتھیوں کی مدد کے لیے سیکڑوں ملازم لگا رکھے ہیں۔جو دن رات پاکستان آتے جاتے رہتے ہیں۔گم شدہ بچوں اور خاص طور پر عورتوں کی معلومات حاصل کرتے رہتے ہیں۔سب نے بھروسہ دلایا ہے کہ وہ ہمارے قصبے کے ایک ایک مکان میں سے گم شدہ بچوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالیں گے۔ہمارے آفیسر اور پاکستان کے افسران سب ایمانداری سے اپنی تلاش میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھیں گے۔مجھے امید ہے کہ ہمارا پالی ہمیں ضرور مل جائے گا۔تو دیکھنا جلدی ہی یہ لوگ وہاں پہنچ جائیں گے جہاں پر پالی کا ہاتھ میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا۔

منوہر لال نے لاکھ دشواریوں کے باوجود اپنی دوڑ دھوپ میں کوئی کمی نہ رکھی۔دن ہفتوں میں، ہفتے مہینوں میں گزرتے گئے۔دونوں طرف کے سرکاری افسران، سماجی خدمت گار شرنارتھیوں کی مدد کرنے میں لگے ہوئے تھے۔پر یہاں اس کی تلاش کا کوئی کنارا نہیں مل رہا تھا۔ قریب دو سال تک منوہر لال کا کیس ہوا میں لٹکا رہا۔ برآمدگی میں مصروف تمام ملازم اور خدمت گاروں کی ٹولیاں جاتیں تو وہ بھی اپنی صندوقچی اٹھائے ان کے ساتھ ہولیتا۔پر ہر بار ہی ناکام ہوکر لوٹ آتا۔

لیکن دو سال بعد سراغ مل ہی گیا۔پتہ چلا کہ اس کے ہی قصبے کے کسی محلے میں شکور نام کے ایک برتن فروش کے گھر میں بچہ رہ رہا ہے اور برآمدگی میں مصروف ٹولی جب روانہ ہوئی تو منوہر لال پھر سے امیدوں کا سہارا لیے ان کے ساتھ چل دیا۔اب یا تو یہ کہ منوہر لال پر قسمت مہربان تھی یا یہ کہ کوشلیا کی آہوں کا اثر تھا پورے پانچ سال بعد منوہر لال شکور کے گھر کے آنگن میں بیٹھا تھا۔ساتھ میں ہندوستانی افسران اور سماجی سویکائیں اور خدمت گار بھی تھے۔پاکستان کا پولیس افسر اور ایک مجسٹریٹ بھی تھا۔درحقیقت یہ اس سفارش کا اثر تھا جو منوہر لال کے لیے کسی اچھے ایماندار سرکاری افسر نے پاکستان کے کسی اثر رسوخ والے افسر سے کی تھی۔ان بڑے لوگوں کی مہربانی کے باعث ہی آج سب شکور کے صحن میں موجود تھے، قانونی کارروائی شروع ہوچکی تھی۔

کارروائی شروع ہونے سے پہلے مولوی طرح طرح کی بھڑکاؤ باتیں کیے جارہا تھا۔''کوئی بچے کو نہیں لے جاسکتا،کوئی کافر اسے ہاتھ نہیں لگا سکتا۔یہ مذہب کا معاملہ ہے۔بچہ کلمہ پڑھ چکا ہے۔دین قبول کرچکا ہے۔'' ہندوستان سے آئی ٹولی بار بار مجسٹریٹ صاحب سے درخواست کررہی تھی کہ مولوی صاحب کو خاموش رہنے کا حکم دیں کہ ایسی باتوں سے تناؤ پیدا ہوگا جو ہم سب کی جان کے لیے بھی خطرہ پیدا کرسکتا ہے۔

''بچے کو طلب کرو۔'' مجسٹریٹ کی آواز گونجی۔ لوگوں میں خاموشی طاری ہوگئی۔''ہم نے کوئی بچہ چرایا نہیں ہے۔ہم بچے کو کیوں بھیجیں۔'' زینب نے پردے کے پیچھے سے جواب دیا۔

''بچے کو طلب کرو۔'' مجسٹریٹ نے پھر حکم دیا۔ جس پر شکور احمد ٹاٹ کے پردے کے پیچھے بچہ لانے کے لیے چلا گیا۔اور آکر بچہ کو مجسٹریٹ کے سامنے پیش کردیا۔ آنگن میں لوگوں کی بھیڑ دیکھ کر وہ بچہ گھبرا کر شکور کے ساتھ چپک گیا۔

''بیٹے ادھر آؤ۔دیکھو تو یہ کون ہیں؟ ان میں سے کسی کو تم جانتے ہو''؟ مجسٹریٹ نے پوچھا۔اس پر سب کو مخاطب ہوکر یہ بھی کہا۔''کوئی بھی کچھ نہیں بولے گا۔بچے کو خود پہچاننے دو۔''

منوہر لال خود اپنے بچے کو نہیں پہچان سکا۔نو برس کا۔اونچا قد۔سر پر ٹوپی۔ململ کا کرتا اور شلوار۔منوہر لال کی اپنی آنکھیں اسے دھوکہ دے رہی تھیں۔پھر جوں ہی بچے کی پہچان اس کے دماغ میں آئی۔اس کا گلا روندھ گیا۔وہ چلا کر کہنا چاہتا تھا۔''پالی۔پالی'' پر وہ بڑی مشکل سے اپنے آپ کو روک پایا۔والد کو دیکھ کر بھی بچہ کے ردعمل میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔وہ پہلے سے سہما ہوا تھا۔اتنی بھیڑ دیکھ کر وہ اور بھی سہم گیا اور شکور کے ساتھ لپٹ گیا تھا۔سب لوگ حیران تھے۔منوہر لال کو لگا فیصلے کی گھڑی آئی اور نکل گئی اور کچھ بھی نہ ہو پایا۔اب وہ زندگی کے بیابانوں کی خاک چھانتا رہے گا۔چاروں طرف چھائی خاموشی کو توڑتے ہوئے مولوی بولا۔''دیکھ لیا بچے نے نہیں پہچانا۔ان کا ہوتا تو بھاگ کر ان کے پاس نہ چلا جاتا۔بڑی اکڑتھی کہ بچے کو لے کر جائیں گے۔'' تب ہی سماجی خاتون نے منوہر لال کو مخاطب کیا۔''وہ تصویر کہاں ہے جو آپ مجھے دکھا رہے تھے۔؟'' منوہر لال کے پاس ثبوت کے بطور لانے کو کچھ اور تھا ہی نہیں اس کے پاس ایک چھوٹی سی تصویر تھی۔یہ تصویر اس نے ایک میلے میں اپنے پتا اور ماتا کے ساتھ کھنچوائی تھی۔اس نے جیب سے تصویر نکال کر مجسٹریٹ کے ہاتھوں میں دے دی۔اس پر شکور احمد جذباتی ہوکر بولا''تصویر سے کیا ہوگا۔جناب تصویر تو ہمارے پاس بھی ہے۔'' اور اسی وقت واپس قدموں جاکر ایک فریم شدہ تصویر صاف کرتے ہوئے اٹھالایا جس میں بچہ اپنی امی ابا اور استانی کے ساتھ کھڑا تھا اور لاکر مجسٹریٹ کے سامنے رکھ دی۔

''ادھر آؤ بیٹا۔'' مجسٹریٹ نے بچے کو اپنے پاس بلایا اور فوٹو اس کے سامنے رکھ دیا۔ان میں سے تم کس کس کو پہچانتے ہو۔پہلی تصویر کو دیر تک دیکھتا رہا پھر اپنی پہلی انگلی اٹھا کر تصویر پر رکھتے ہوئے اونچی آواز سے بولا۔''پتا جی۔پھر اسی تصویر میں دوسری تصویر پر انگلی رکھتے ہوئے بولا'ماتا جی'ایک انجانی سی بے چینی بچے کے دل میں کروٹیں لینے لگیں۔منوہر لال بلک بلک کر رونے لگا اور اپنی سسکیاں دبا پانے کے لیے اپنی پگڑی کا آخری سرا اپنے منہ میں ٹھونسنے لگا۔مجسٹریٹ نے دوسرا فوٹو بچے کے سامنے رکھ دیا۔بچہ کا چہرہ کھل اٹھا اور چہک کر بولا۔ ''اماں۔ابا''ٹاٹ کے پردے کے پیچھے زینب کی آنکھیں بھی بھر آئیں۔مولوی صاحب کے تیور جو ابھی تک چڑھے ہوئے تھے بچے کا جواب سن کر ذرا ڈھیلے پڑے۔''اب یہ مسلمان کا بیٹا ہے،کافر کا نہیں۔اب یہ کلمہ پڑھ چکا ہے۔اس کو کوئی نہیں لے جاسکتا۔'' مجمع میں شامل لوگ نعرے لگانے لگے۔مولوی مسلسل چلائے جارہا تھا۔ اس کی پرورش تو ہم نے کی ہے۔''

بات بگڑتی جارہی تھی۔ہوا میں پھر سے تناؤ پیدا ہونے لگا تھا۔اُدھر بچہ ٹاٹ کے پردوں کے پیچھے ڈرا،سہما زینب کی گود میں سر رکھ کر اس کی بانہوں میں چھپنے کی کوشش کررہا تھا۔منوہر لال کو اور کچھ نہیں سوجھا۔اس کی سمجھ میں

نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے کس سے کیا کہے۔ وہ چپ چاپ چلتا ہوا ٹاٹ کے پردے کے پاس جا کر کھڑا ہوگیا اور دونوں ہاتھ جوڑ کر بولا۔ ''میں تم سے بچے کی نہیں۔ اپنی گھر والی کی جان کی بھیک مانگنے آیا ہوں۔ وہ اپنے دونوں بچے کھو چکی ہے۔ ہم لٹ چکے ہیں۔ ہمارے پاس بس یہ ہی ایک امید بچی ہے۔ شاید اس کو پا کر میری نیم پاگل بیوی کو زندگی مل جائے۔'' سب دیکھنے والوں کا یہ خیال تھا کہ پردے کے پیچھے سے اس کو صرف انکار ملے گا۔ سب کی آنکھیں ٹاٹ کے پردے پر جمی ہوئی تھیں۔

پر پھر ایک ٹوٹی پھوٹی سی درد میں ڈوبی آواز آئی۔ ''لے جاؤ اپنے بچے کو۔ ہم نہیں چاہتے کسی بدنصیب کی بددعائیں ہمیں لگیں..... ہم کسی کی کوکھ اجاڑ کر نہیں رہ سکتے۔'' منوہر لال کا من ہوا ٹاٹ کے پردے کے پیچھے جا کر اس دیوی کے قدموں میں اپنا سر رکھ دے۔ ''لیکن ہماری ایک شرط ہے۔ پردے کے پیچھے سے آواز آئی۔ ''پر ایک شرط پر بچہ واپس کروں گی..... ہر سال عید کے موقع پر اسے ہمارے پاس ایک ماہ تک رہنے کے لیے بھیجو گے۔ بولو منظور ہے۔'' منوہر لال ویسے ہی ہاتھ جوڑے بولا ''تمہاری دولت ہے۔ بہن۔ تم نے اس کو پال کر بڑا کیا ہے۔ میں وعدہ کرتا ہوں جنم جنم تک تمہارا احسان نہیں بھولوں گا۔''

باوجود شور اور دھمکی آمیز رویہ کے بچہ منوہر لال کو سونپ دیا گیا اور اسی سرکاری جیپ میں سوار ہو کر واپس ہوگئے۔ سرحد کے قریب پولیس پوسٹ پر دونوں ممالک کے افسران نے کاغذات چیک کیے پھر جیپ میدانوں کو پار کرتے ہوئے ہندوستانی سرحد کے درمیان داخل ہی ہونے والی تھی کہ پچھلی سیٹ پر بیٹھی ایک سماجی خدمتگار خاتون کو جانے کیا سوجھی اپنا دایاں ہاتھ بڑھا کر بچہ کے سر سے رومی ٹوپی اتاری اور جیپ سے باہر ہوا میں اڑا دی۔ کالے پھندنے والی لال رنگ کی ٹوپی اڑتی ہوئی سڑک کے کنارے دھول مٹی میں جا گری۔

''میری ٹوپی۔'' بچہ کا ہاتھ سر پر گیا۔ ''ہائے میری ٹوپی۔'' اس پر خاتون خدمتگار آگے کی طرف جھکتے ہوئے بولی۔ ''ہندو کا بچہ ہے تو مسلمانی ٹوپی کیوں پہنے گا؟'' اچانک اس طرح بچہ کے سر سے ٹوپی پھینکنا منوہر لال کو اٹ پٹا سا لگا۔ اس سے بچے کے دل کو جو ٹھیس پہنچی ہوگی اس کے درد کو منوہر لال نے محسوس کیا۔ اس نے آہستہ سے شکایتاً کہا ''بچے کو کیا معلوم کہ یہ مسلمان ٹوپی ہے۔ آپ نے کیوں پھینک دی۔ جیپ روکئے میں اٹھالاتا ہوں۔'' بچہ مسلسل روتا جا رہا تھا۔ منوہر لال حسرت بھری نظروں سے دور ہوتی ٹوپی کو دیکھے جا رہا تھا۔ ''رونے دو۔ رونے دو۔ کوئی بات نہیں۔ اب اسے رومی ٹوپی تو نہیں پہناؤ گے۔ ابھی تھوڑی دیر میں چپ ہو جائے گا۔'' اور جیپ دھول اڑاتی آگے بڑھتی ہی گئی۔

جیسے تیسے منوہر لال کے ساتھ منہ بسورتا بچہ گھر پہنچ گیا۔ پہلے دن ماں کو بچہ دور سے ہی دیکھتا رہا، ماں کی ساری جوانی ہی ڈھیر ہوگئی تھی۔ بچے کے دماغ میں دھیرے دھیرے دھندلی یادیں لوٹ رہی تھیں۔ ماں کی گود میں اسے اپنی چھوٹی بہن کی یاد آئی۔ پھر اسے وہ بھینس یاد آئی جس پر وہ چڑھا کرتا تھا۔ اسے وہ تخت یاد آیا جو اس کے گھر کے باہر بچھا رہتا تھا۔ ہر طرف رونق اور شور شرابا۔ بچہ کی ماں کی پریشانی آہستہ آہستہ کم ہوتی جا رہی تھی۔ اسے یقین ہی نہیں ہو رہا تھا کہ یہ جو بچہ سامنے کھڑا ہے اسی کا بیٹا ہے۔ پالی! لیکن کوئی بے چینی تھی، پریشانی تھی، وسوسے تھے جو اس کا پیچھا نہیں چھوڑ رہے تھے۔ تین چار دن اسی حالت میں گزر چکے تھے۔

اتوار کا دن تھا۔ گلی محلے کی عورتیں بیٹھی گیت گا رہی تھیں۔ بچہ کے لوٹ آنے کی خوشی میں منوہر لال سب آس پڑوس اور دیگر مہمانوں کے درمیان لڈو بانٹ رہا تھا۔ کبھی ایک ہمسائے کے سامنے، کبھی دوسرے ہمسائے کے سامنے اس کی زبان پر زینب اور شکور احمد کی انسانیت کا ذکر تھا۔ بار بار کہہ رہا تھا۔ ''انہوں نے لڑکے کو چھاتی سے لگا کر رکھا ہے۔ میں تو زندگی بھر ان کا یہ احسان نہیں بھول سکتا''۔ ''بے شک۔ بے شک دنیا میں نیک لوگوں کی کمی نہیں ہے۔'' لوگ سر ہلا ہلا کر کہتے۔ آنگن لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس وقت پالی، ماں کے ساتھ چپکا ہوا کھڑا تھا اور آنگن میں ڈھولک بجانے والی عورتوں کو ڈھولک بجاتے دیکھ رہا تھا۔ اچانک تبھی چپ چاپ اٹھا اور دائیں ہاتھ والی کوٹھری سے جا کر ایک چٹائی اٹھا لایا اور اسے آنگن کے ایک طرف کونے میں بچھا کر اس پر کھڑا ہو کر نماز پڑھنے لگا۔ آنگن میں موجود بہت سی عورتیں اور مرد بڑی حیرانی کے عالم میں اس کی طرف دیکھنے لگے۔ سب کی آنکھیں ابلی پڑ رہی تھیں۔

''ہائے یہ کیا ہو رہا ہے کوشلیا۔ تیرا بیٹا یہ کیا کر رہا ہے''؟ کسی عورت نے زور سے کوشلیا کو متوجہ کیا۔ اس پر منوہر لال نے پاس کھڑے آدمی سے کہا۔ ''دوپہر کو اس وقت ہر روز اٹھ کر نماز پڑھنے لگتا ہے۔ اسے اپنے آپ پتہ چل جاتا ہے کہ اب نماز کا وقت ہے۔'' منوہر لال نے سادگی سے یہ بات کہہ دی لیکن وہ جھینپ رہا تھا۔ اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا کہ اس نے پالی کو پہلے سے کیوں یہ بات نہیں بتائی کہ کسی کے سامنے نماز نہ پڑھے۔ غلطی اس کی تھی۔

''آپ اسے روکتے کیوں نہیں؟'' ایک آواز آئی۔ اس پر ایک شخص جو شاید محلّہ کا چودھری تھا اونچی آواز میں بولا۔ ''ابھی چھڑاؤ گے تو یہ عادت چھوٹ جائے گی، نہیں تو یہ لڑکا مسلمان ہی بنا رہے گا۔'' منوہر لال بار بار کہے جا رہا تھا۔ ''ان کا اپنا کوئی بچہ نہیں تھا۔ بے اولاد تھے۔ انہوں نے پورے پانچ سال تک اپنی چھاتی سے لگا کر بچے کی پرورش کی ہے۔ میں تو ان کا احسان کبھی بھی نہیں بھول سکتا۔ بچہ ہو سکتا ہے آہستہ آہستہ نماز پڑھنا بھول جائے۔ میں کس طرح اس معصوم پر زبردستی پابندی عائد کروں۔'' اس پر محلّہ کا چودھری چلا کر بولا۔ ''لڑکے کو مسلمان بنا کر بھیجا ہے۔ پھر بھی ان کی صفائی دیئے جا رہا ہے۔'' محلّہ کا چودھری بچے کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ بچے نے نماز ختم ہوتے ہی دونوں ہاتھ سینہ پر پھیرے ہی تھے کہ چودھری نے لڑکے کو کلائی سے پکڑا اور کھینچتے ہوئے آنگن میں لے آیا اور بچے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ''یہاں یہ سب نماز وماز نہیں چلے گی۔'' اور آس پاس کھڑے لوگوں سے مخاطب کر کے بولا۔ ''مسلمانوں نے تعصب کا زہر ابھی سے اس کے ذہن میں بھر دیا ہے۔ پھر اسی طرح اونچی آواز میں اپنے کسی ساتھی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ''بلاؤ کسی پنڈت کو اور ساتھ میں نائی کو بھی۔ ابھی اسی وقت اس کا منڈن کرواؤ اور چٹیا رکھواؤ۔ ان کی ایسی کی تیسی۔ بچے کو مسلمان بنا کر بھیجا ہے۔'' بچہ گھبرایا ہوا اور روہانسا ہو رہا تھا۔

''کیا نام ہے تیرا۔'' چودھری غرایا۔ بچے نے سہمی ہوئی آواز میں کہا ''الطاف حسین''۔ ''نہیں تیرا نام پالی ہے۔ یشپال پالی۔'' تب ہی پنڈت وہاں پہنچ گیا۔ نائی چھوٹی سی صندوقچی بغل میں دبائے ہوئے تھا۔ ایک اور آدمی کے سر پر ہون کنڈ تھا۔ اس کے ساتھ ایک اور آدمی کے ہاتھ میں گھی کا دیا اور دیگر اشیا تھیں۔ بچے کو چٹائی پر بٹھایا گیا۔ نائی استرا ہاتھوں پر تیز کرتے ہوئے بچہ کی طرف بڑھا۔ منڈن ہوا۔ چوٹی رکھوائی گئی۔ نہلایا گیا اور دھوتی کرتا پہنایا گیا۔ اشلوکوں اور منتروں کے شور میں جنیو پہنایا گیا۔ پالی باپ کی طرف دیکھتا اور منہ بسورتا کھڑا تھا۔

دور کھڑا انسان مذہبی جنونیوں کی ریاکاری پر خون کے آنسو بہا رہا تھا۔

☆☆

شیریں نیازی



پگلی

چناؤ کا موسم آ کر گزر گیا تھا اور اب سارے میں سناٹے کی چادر پھیل گئی تھی۔ کچھ دنوں پہلے تک ہماری گلی میں بھی بے انتہا ہنگامے بکھرے ہوئے تھے۔ نعرے بازی، بھاشن، سجاوٹیں۔ گلی گلی میں پھر پھراتی ہوئی جھنڈیاں اب سب کچھ شانت ہو گیا تھا۔ کرسیوں والے اپنی اپنی کرسیاں سنبھال چکے تھے۔ گردھاری لال جی نے بہت سارے ووٹوں سے مخالف پارٹی کو ہرا دیا تھا۔ اور اب وہ اس راجیہ کے مکھیہ منتری بن کر اونچی کرسی پر براجمان تھے۔ اس بار کی زبردست جیت کی وجہ تھی ان کی دریا دلی۔ انہوں نے ایک ایسا کام کر دکھایا تھا جو شاید کوئی نہ کر پاتا۔ جھونپڑ پٹی کی ایک بے انتہا غریب ماں باپ کی بیٹی کو اپنے گھر کی ملکہ بنانا۔ جب کہ ان کا ایک ہی بیٹا تھا۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور امریکہ جیسے ملک میں ایک بہت بڑی پوسٹ پر کاریہ رت۔ جس کے اردگرد اربوں کھربوں کے مالکوں کی بیٹیاں آنکھیں بچھائے کھڑی تھیں اور اس کی شادی جھونپڑ پٹی کی ایک لڑکی سے ہو جائے۔ یہی نہیں گردھاری لال جی نے اس کے گھر کو بھی سجا سنوار دیا تھا۔ ماں باپ کے لیے زندگی بھر کھانے پینے کا انتظام کرایا تھا اور شادی کے فوراً بعد انہیں چاروں دھام کی یاترا پر بھیجنے کے بعد ہی سکون کی سانس لی تھی۔ یہ بات الگ ہے کہ کمل نین کا بلاوا شادی کے دن ہی اس کی کمپنی سے آ گیا تھا ایمرجنسی تھی۔ سونینا کو چھوڑ کر کمل نین کو جانا پڑا۔ جاتے جاتے وعدہ کر گیا تھا کہ تین مہینے کے اندر ویزا بنوا کر وہ اسے اپنے پاس بلا لے گا۔ یہ خبر راجیہ کی راجدھانی سے نکل کر ٹہلتے ٹہلتے ہماری گلی تک بھی آ پہنچی تھی۔ اور اب ہر

ٹیچرس کالونی، ریور سائڈ، بھرکھنڈہ، رام گڑھ، جھارکھنڈ۔35
فون:8877115711

ایک کی زبان پر مکھیہ منتری گردھاری لال کی عظمت کے قصیدے، پوتر گرنتھوں کے شلوک کی طرح پڑھے جا رہے تھے۔

ہمارا یہ علاقہ ایک 'انڈر کنسٹرکشن' علاقہ تھا۔ اس طرف کچھ سال پہلے تک بانسوں کا گھنا جنگل بسا ہوا تھا لیکن انسانوں کی ضرورتوں کے کارن جنگل کو کم کر کے آبادی قائم کرنے کی سوچی گئی۔ سڑک سے سٹے ہوئے جنگلوں کو پیچھے کی طرف دھکیلا جانے لگا اور بلڈروں نے مکانات کی تعمیر شروع کی۔ اس علاقے میں شروعات میں زمینیں سستی مل رہی تھی سو ہمارے لوگوں نے اپنی اپنی اوقات کے مطابق بکنگ کرانی شروع کر دی۔ ایک لائن میں آٹھ بلاک، ہر بلاک میں اوپر نیچے ملا کر آٹھ فلیٹ کا پلان پاس ہوا۔

ہم ذرا لیٹ ہو گئے تھے اس لیے ہمیں جو فلیٹ ملا وہ تیسری لائن میں تھا۔ یعنی کہ سڑک سے لگا ہوا نہ ہو کر پیچھے کی طرف تیسرے بلاک کی دوسری منزل پر۔ جہاں سے بانسوں کا جنگل اور اس کے بیچ بنی ہوئی ایک جھونپڑی جو کسی زمانے میں بانسوں کی حفاظت کرنے والے پہریدار کے لیے بنی ہوگی۔ کیونکہ اس وقت آس پاس کے گاؤں والے بانسوں کی کھپچیوں سے اپنے گھر بنایا کرتے تھے۔ کچھ مکانات مٹی کے بھی ہوا کرتے تھے جو بارش کے دنوں میں ڈھ جاتے تھے اور غریبوں کو ہر سال اپنا کنبہ پالنے کے لیے تنکے بٹورنا پڑتا تھا۔

دھیرے دھیرے ترقی ہوئی تو بانسوں کی جگہ کھپریل نے لے لی۔ کھپریل کے لیے بھی بانس کی کھپچیوں اور بلیوں کی ضرورت ہوتی ہی ہے۔ اس لیے یہ بانس کا جنگل اب بھی قائم تھا۔ گرچہ اس جھونپڑی میں اب کوئی پہریدار نہیں رہتا تھا۔

آٹھوں بلاکوں کے پیچھے تھوڑی کھلی زمین چھوڑ دی گئی تھی جو میدان کی شکل میں بچوں کے کرکٹ یا فٹبال کھیلنے کے کام آتی تھی۔ ہماری بلڈنگوں میں اس طرف بالکنیاں بنی تھیں۔ وہاں کھڑی ہو کر عورتیں صاف طور پر اپنے کھیلتے ہوئے بچوں کو دیکھ سکتی تھیں، کپڑے سکھا سکتی تھیں، ہریالی کی خوشبو سونگھ سکتی تھیں۔ کنگھی چوٹی، پڑھائی لکھائی اور سلائی کڑھائی بھی کیونکہ وہاں کھلی کھلی روشنی ہوا کرتی تھی، ہوا آتی تھی۔

ایک دن منو ہانپتا کانپتا گھر آیا اور ماں سے بولا۔

''ممی..... ممی۔ اس جھونپڑی میں ایک پگلی رہتی ہے۔''

''تمہیں کس نے بتایا۔؟''

''ہم نے دیکھا ہے خود۔ پپو، گڈو نے بھی دیکھا ہے۔ اس نے ہم کو ہماری بال بھی دی ہے۔''

''کیا.....؟ تم لوگ اس کے پاس گئے تھے؟''

''ہم اس کے پاس نہیں گئے تھے ممی..... ہم جب کھیل رہے تھے تو ہماری بال جنگل کے اس طرف چلی گئی۔ ہم لوگ تو بال.....''

''بال ڈھونڈنے گئے تھے..... ہیں.....؟ کیوں گئے تم لوگ وہاں۔ ایسی خطرناک جگہ پر۔ اچھا یہ بتاؤ کیا تم میں سے کسی کو اس نے چھوا بھی؟

''نہیں..... ممی..... ہماری بال لڑھکتی ہوئی جھونپڑی کے پاس چلی گئی تھی۔ ہم نے سوچا اٹھا لیں۔ ہم تینوں گئے تھے۔ لیکن قریب پہنچنے سے پہلے ہی اس نے بال ہماری طرف اچھال دی تھی۔

وہ کالے رنگ کا کپڑا پہنے ہوئی تھی۔ اس کا منہ ڈھکا

ہوا تھا۔ بال کھلے تھے اور آنکھیں یہ بڑی بڑی۔ اس نے اپنی آنکھوں کی طرف ہاتھ لے جا کر بڑا سا دائرہ بنایا۔

منو کی ممی کانپ اٹھی تھی۔ فون لگا کر اوپر کی منزل پر رہنے والی پپو کی ممی کو نیچے آنے کے لیے کہا۔ اسی طرح گڈو اور دوسرے بچوں کی ممیوں کو بھی بلا لیا۔ پھر منو کی کہی تمام باتیں انہیں بتائیں۔

اور پھر سب نے مل کر یہ فیصلہ کیا کہ بچوں کو کھیلنے کے لیے اس طرف نہیں جانے دینا ہے۔ کون جانے بچہ چور ہو.....!

بچے روہانسے ہو گئے۔ بے کار ہی ممی کو بتانے گیا تھا۔ اب ہم کہاں کھیلیں گے؟ منور رو دیا..... مگر ممی کی بات ماننی بھی ضروری تھی۔ ہم سب کی ممیوں نے ہمیں سمجھایا تھا نا کہ اپنے آس پاس کچھ الگ دیکھو تو گھر والوں کو ضرور بتا دو۔

''پر اس سے ہمارا کھیلنا جو بند ہو گیا۔'' منو کی اس بات کا جواب کسی کے پاس نہ تھا اور اب شام ڈھل رہی تھی۔ آسمان کے کنارے لٹکا ہوا سنہرا گولا جھیل میں ڈبکی لگانے کے لیے تیار ہو رہا تھا۔

جس رات کمل نیل نے امریکہ جانے والی فلائٹ پکڑی اسی رات ایک بہت بڑے ہوٹل میں اس کامیابی کا جشن منایا جانا تھا۔ گرچہ کمل نین کا جانا ضروری تھا۔ لیکن پارٹی تو ہونی ہی تھی۔

لگ بھگ دو بجے رات کو مکھیہ منتری جی دو لوگوں کے ساتھ اپنے نواس پر واپس لوٹے تھے۔ وہ لوگ انہیں گھر چھوڑ کر اور گھر کے پرانے ملازم رام دیو کو ضروری ہدایتیں دے کر واپس لوٹ گئے تھے۔ رام دیو جب سے بی بی جی یہاں سے گئی تھیں۔ اندر ہی رہتا تھا، باقی سارے نوکر شاگرد پیشے میں۔

یہ کوئی پچیس برس پہلے کی بات ہے۔ تب کمل نین تین سال کا بچہ تھا۔ گردھاری لال جی کی شادی کی چوتھی سالگرہ تھی۔ بی بی جی تیار ہو کر انتظار کر رہی تھیں۔ ان کا بریف کیس ان کے پاس رکھا ہوا تھا۔ گردھاری لال جی نے خبر بھجوائی تھی کہ اس وقت ایک ضروری میٹنگ میں ہیں۔ لیکن وقت پر پہنچ جائیں گے۔ اس بار کوتاہی نہ ہوگی۔

لیکن..... اس بار بھی وقت سرکتا جا رہا تھا اور وہ انتظار کے دیے جلائے بیٹھی تھیں۔ کمل نین کے سلسلے کی ضروری ہدایات وہ اس کی گورنس مسز فلومینا کو دے کر ان کے حوالے کر چکی تھیں۔

پھر وہ اچانک اٹھیں اور ایک مضبوط ارادے کے ساتھ باہر کی طرف نکل گئیں۔

''رام دیو کا کا۔ اب بہت دیر ہو چکی ہے فلائٹ کا وقت قریب ہے۔ آج ہم خود انہیں ہوٹل سے پک اپ کرنے جا رہے ہیں۔ گھر کا خیال رکھئے گا۔

''مگر بی بی..... آپ تو کبھی.....''

''ہاں کا کا۔ ہم آج تک اکیلے نہیں نکلے۔ ہماری دنیا گھر تک ہی محدود رہی۔ لیکن اب ہمیں بھی اپنے اندر مضبوطی لانی ہوگی نا؟ کیا کریں ان کا کام ہی ایسا ہے۔

ڈرائیور ایئر پورٹ جانے کے لیے گاڑی پہلے سے ہی تیار کیے بیٹھا تھا۔

''ایئر پورٹ میڈم؟''

''نہیں..... وہاں چلو، جہاں صاحب کی میٹنگ ہے۔''

''وہاں..... میڈم..... وہ..... وہ تو.....''

ڈرائیور ہکلا گیا۔

''تو اکیلے ایئر پورٹ جا کر ہم کیا کریں گے؟ صاحب کو لینا ہے نا.....''

ریسپشنسٹ سے کمرے کا نمبر لے کر وہ اس طرف چل دیں۔ چند لوگوں نے انہیں روکنے کی کوشش بھی کی۔ لیکن ڈرائیور نے انہیں اشارے سے بتایا کہ یہ مسز گردھاری لال ہیں۔

دروازہ کھٹکھٹانے پر گردھاری لال جی کی نشے میں دھت آواز سنائی دی۔ ''ابے کون کمبخت اس وقت ہمیں ڈسٹرب کرنے یہاں آ گیا۔ ڈارلنگ، ذرا دیکھو تو سہی۔''

ڈار..... لنگ..... یہ لفظ سنتے ہی وہ چونک پڑیں۔ انہیں لگا کسی بچھو نے انہیں ڈس لیا ہے۔ تلملا کر ہاتھ میں پکڑی بریف کیس کھڑکی کے شیشے پر دے ماری اور گردھاری لال اپنی تمام عریاں حقیقتوں کے ساتھ ان کے سامنے آ گئے۔

پھر کیا ہوا کسی نے نہیں دیکھا۔ سوائے رام دیو کے۔ وہ چپکے چپکے بی بی جی کے پیچھے چلا آیا تھا۔ پھر اس نے یہی دیکھا کہ بی بی جی ہوٹل کے پیچھے والے راستے سے نکل کر تیزی سے ندی کی طرف چلی جا رہی ہیں۔

آگے جھاڑیوں میں انہیں ایک لڑکی کی برہنہ لاش پڑی دکھائی دی تھی اور انہوں نے اپنی شال اتار کر اس لاش پر ڈال کر پتھروں سے اس کے کونے دبا دیے تھے تاکہ شال اڑ نہ جائے۔

لڑکی کا چہرہ پوری طرح مسخ کیا ہوا تھا تاکہ پہچان میں نہ آئے۔

شال اوڑھا کر بی بی جی نے اس لاش کو گویا مخاطب کر کے کہا تھا۔

''بیٹی تو جو بھی ہے جس ذات اور جس نسل کی ہے۔ کسی کی بیٹی ہی ہے۔ اور آج تجھ سے وعدہ کرتی ہوں جس دن مجھے پتہ چل گیا کہ تیری یہ حالت کس نے کی ہے اس دن اسے اس کرم کی سزا ضرور دوں گی.....''

رام دیو نے اطمینان کی سانس لی۔ بی بی جی مرنے نہیں، جینے کے لیے نکلی ہیں اور پھر وہ وہاں سے لوٹ آیا تھا۔

اس بیچ جانے کب کب اور کہاں کہاں کون سا راز دفن ہوا ہوگا۔ رام دیو کی تجربہ کار آنکھیں سب کچھ سمجھ کر بھی خاموش رہنے پر مجبور تھیں۔ اخبار والوں نے اس وقت بھی یہ خبر چھاپی تھی کہ منتری جی کی پتنی پر کسی جنگلی جانور نے حملہ کر کے ان کے چہرے کا سارا گوشت کھا ڈالا ہے۔ منتری جی یہ صدمہ سہن نہیں کر پائے اور انہیں ہارٹ اٹیک آ گیا۔ کوما میں ہونے کے کارن پتنی کی انتم کریا میں شامل نہیں ہو پائے.....!

وقت کا پنچھی اپنے پر پھیلائے اوپر آسمانوں میں پرواز کرتا رہا۔ فلومینا کے آنچل کے سائے میں کمل نین پلتا رہا اور پورے پچیس سال بیت گئے۔ ودیش سے پڑھائی پوری کر کے جب وہ لوٹا تو اس کی شادی کی بات چلنے لگی۔ بہت سارے رشتے اس کے قدموں پر نثار ہونے کو تیار کھڑے تھے۔ چناؤ کا موسم بھی آ گیا تھا۔ اس لئے گردھاری لال جی کو اپنے وجود کی اہمیت کو دائمی حیثیت دینے کے لیے 'سونینا' کے وجود کی ضرورت محسوس ہوئی جس کے سہارے بلندی کی تمام منزلیں طے کر کے آسمان کی اونچائیوں کو چھو سکیں۔ اور پھر 'کمل نین' کے لیے 'سونینا' کو چن لیا۔ جس کی وجہ سے جھونپڑ پٹی کے تمام تر ووٹ ان کے دامن میں آ گرے۔ دور دور تک شہرت ہوئی۔ ہر کسی نے انہیں دیوتا مان لیا۔

جیت کے جشن کی رات کو ہی کمل نین کی فلائٹ بھی تھی۔ اس رات گردھاری لال دو بجے کے قریب دو لوگوں کے سہارے گھر لوٹے تھے اور سونینا اس رات کی صبح ہوتے ہی اپنے میکے لوٹ آئی تھی، جہاں مکان خالی پڑا تھا۔ ماں باپ تیرتھ یاترا پر تھے۔ لیکن جھونپڑ پٹی کے تمام لوگوں نے اس کا بھرپور سواگت کیا تھا۔ سونینا کی خوشحال زندگی پر سب نازاں تھے۔ بیٹیوں والے اپنی اپنی بیٹیوں کے لیے دعائیں مانگ رہے تھے۔ کاش سونینا جیسا گھر اور ور انہیں بھی مل جاتا۔

جس رات مسز گردھاری لال گھر چھوڑ کر گئیں اس رات کی بات ابھی تک رام دیو کے سینے میں دفن تھی اور پچیس سال بعد جب گھر کی بہو اپنے میکے لوٹی..... اس رات کی سرگوشی بھی اس کے کانوں میں سرسرا رہی تھی۔ اس لیے جاتی ہوئی بہو کو اس نے روکنے کی کوشش بھی نہیں کی۔

سونینا نے بھی سب کو بتایا تھا کہ وہ ''اپنی پڑھائی پوری کرنے یہاں آ گئی ہے۔ اکیلے ڈھنڈار گھر میں اس کا جی نہیں لگا۔ وہاں کھانے سونے کے سوا کوئی کام ہی نہیں ہے۔ جلد ہی کمل نین ویزا بھجوا دیں گے اور ہم وہاں چلے جائیں گے۔''

رام دیو کو اس گھر میں رہتے ہوئے پورے پچاس برس ہو گئے تھے اور ان پچاس برسوں کے سارے راز اس کے سینے میں دفن تھے۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ جشن کی اس رات نشے میں ڈوبے سیٹھ جی سونینا کے کمرے میں کیا کرنے اور کہنے گئے تھے اور ان کے سر میں چوٹ کیسے لگی تھی؟

بہرحال پچیس برس پہلے کی طرح یہ رات بھی تھی جب اس گھر کی مالکن گھر چھوڑ کر ندی کے کنارے والے راستے پر چلی جا رہی تھیں اور وہاں خودرو جھاڑیوں کے بیچ انہیں ایک لڑکی کی برہنہ لاش ملی تھی اور انہوں نے اس لاش پر اپنی شال ڈال دی تھی۔

لوگوں نے اسی راستے سے سیاہ کپڑوں میں ملبوس ایک پاگل عورت کو گزرتے دیکھا تھا جس کے بال بکھرے اور الجھے ہوئے تھے اور چہرہ ڈھکا ہوا تھا.....

صبح ہوئی تو ایک قیامت خیز خبر سارے میں پھیلی ہوئی ملی۔ گردھاری لال، اسپتال میں ایڈمٹ۔ ان کی حالت نازک ہے۔ کل رات کسی پاگل عورت نے جو سیاہ کپڑوں میں ملبوس تھی ان کی خواب گاہ میں گھس کر ان کے عضو تناسل کو کاٹ ڈالا ہے۔ جب کہ مکانوں کے چاروں طرف سیکورٹی لگی ہوئی تھی۔''

سیاہ کپڑوں میں ملبوس ایک عورت کو ندی والے راستے سے جاتے دیکھا گیا تھا۔ اس راستے کی حقیقت کا پتہ صرف دو لوگوں کو تھا، جن کے ذریعہ گردھاری لال کے خفیہ کام انجام دیے جاتے تھے۔ یہ راستہ زمین کے اندر سے ہو کر گردھاری لال کی خوابگاہ میں کھلتا تھا جو کہ ان کے اونچے پلنگ کے پیچھے قالین سے ڈھکا ہوا، فرش کے برابر تھا۔ جہاں کوئی نشان نہیں بنا تھا لیکن پیر رکھنے پر زمین سرک جاتی تھی۔

رام دیو سوچ رہا تھا ''کیا وہ پاگل عورت اسی راستے سے اندر داخل ہوئی ہوگی؟''

لیکن! ٹیلے کے پیچھے، بڑے پتھر سے دبے، جھاڑیوں سے گھرے اس راستے کا پتہ اسے کس نے بتایا؟''

ستر سالہ رام دیو کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ختم ہوتی معلوم ہوئی۔ اس کے کانوں میں سنسناہٹ ہو رہی تھی اور دماغ سن سا ہو گیا تھا۔

لڑکھڑا کر وہ وہیں زمین میں دھنس گیا۔ اس رات بانسوں کے جنگل کے بیچ بنی اس جھونپڑی سے بہت دیر تک رونے کی آوازیں آتی رہی تھیں۔

اس کے بعد کالے لباس میں لپٹی عورت کو پھر کسی نے نہیں دیکھا!!

☆☆☆

وفیات

نسائی جذبات کی عکاس اور جذبۂ حب الوطنی سے سرشار گفتگو کے لیے یکساں طور پر مقبول **ڈاکٹر مینا نقوی** کی مترنم آواز ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئی۔ وہ 65 برس کی تھیں۔ انہوں نے گوتم بدھ نگر کے ایک اسپتال میں 15 نومبر 2020 کو آخری سانس لی۔ مرحومہ کینسر کے موذی مرض سے نبرد آزما تھیں۔ یہ اطلاع ان کے چچازاد بھائی ڈاکٹر عالمگیر کاظمی نے دی ہے۔ ڈاکٹر مینا نقوی مدھیہ پردیش اردو اکیڈمی کی سکریٹری و معروف شاعرہ نصرت مہدی اور علینا عترت کی حقیقی بڑی بہن تھیں۔

علمی و ادبی حلقوں میں ڈاکٹر مینا نقوی کے نام سے مشہور ہوئی منیر زہرہ کی پیدائش نگینہ کے معزز سید گھرانے میں 20 مئی 1955 کو ہوئی تھی۔ ابتدائی تعلیم مقامی کالج میں حاصل کرنے کے بعد وہ ماہر لسانیات کے طور پر ابھریں اور شعر و سخن میں قدم رکھا تو سائباں، درد پت جھڑ و کا اور بادبان، کرچیاں درد کی، جاگتی آنکھیں، دھوپ چھاؤں، منزل جیسے ادبی لعل و گوہر سے اردو ادب کا دامن بھر دیا۔

☆ ''روزنامہ سچ کی آواز'' نئی دہلی کے سینئر رپورٹر **انور حسین جعفری** کا اچانک دل کا دورہ پڑنے سے 21 نومبر 2020 کو انتقال ہو گیا۔ جعفر آباد میں رہائش پذیر انور جعفری کی طبیعت خراب ہونے پر انہیں دوپہر راجدھانی کے پنت اسپتال کے ایمرجنسی وارڈ میں لے جایا گیا، جہاں ڈاکٹروں نے بتایا کہ ان کی موت ہو چکی ہے۔ 48 سالہ مرحوم نہایت ہی خوش مزاج اور اعلیٰ اخلاق کے حامل انسان تھے۔ قابل ذکر ہے کہ انور جعفری دہلی کے اردو اخبارات روزنامہ 'صحافت' اور روزنامہ 'خبریں' سے وابستہ رہے اور ان کی بہترین خدمات کے لیے مختلف سماجی تنظیمیں انہیں ایوارڈ سے نواز چکی ہیں۔ پسماندگان میں بیوہ سمیت ایک بیٹا اور دو بیٹیاں ہیں۔ آج ان کی رہائش گاہ پر مختلف سیاسی و سماجی شخصیات نے پہنچ کر پسماندگان سے اظہار تعزیت کی اور دعائے مغفرت کی۔ مرحوم کے چھوٹے بھائی 'روزنامہ انقلاب' کے سینئر صحافی و شاعر محمد انجم جعفری کے مطابق بڈھانہ (یوپی) میں ان کی تدفین عمل میں آئی۔

☆ مشہور شاعر **حنیف ترین** کا 3 دسمبر 2020 کو طویل علالت کے بعد سری نگر میں انتقال ہو گیا۔ ڈاکٹر حنیف شاہ خاں ترین، سنبھل (یوپی) کے رہنے والے تھے۔ انہوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کی اور سری نگر سے ایم بی بی ایس کی ڈگری لی۔ وہ پیشہ سے طبیب تھے اور سعودی عرب میں بھی طبی خدمات انجام دے چکے تھے۔ حنیف ترین شاعری کے علاوہ روزانہ اخبارات میں کالم بھی لکھتے تھے۔

اللہ تعالیٰ مرحومین کی مغفرت کرے اور لواحقین کو صبر جمیل عطا کرے۔ آمین (ادارہ)

افشاں احمد



آگاہی

وہ ہمیشہ کی طرح آج بھی صبح تیزی سے اپنے کام کی طرف روانہ ہوا۔ راستے میں خان بازار تھا، جہاں ابھی پوری طرح رونق نہیں ہوئی تھی۔ دُکانیں ابھی کھلنا شروع ہوئی تھیں۔ یہیں وہ بس اسٹاپ تھا جہاں سے وہ اپنے دفتر کو جانے کے لئے بس نمبر 13 لیا کرتا تھا۔ واپسی میں بھی وہ اسی بس اسٹاپ پر اترتا، رات کے کھانے کے لئے کچھ چیزیں خریدتا اور گھر پہنچ کر بیوی کو تھما دیتا تھا۔

یہ اس کا روز کا معمول تھا۔ جس میں شاذ و نادر ناغہ ہوتا تھا۔ لیکن آج کام پر جاتے وقت نہ جانے کتنے سوالات اس کے ذہن میں گردش کر رہے تھے۔ بیوی کی طرف سے خرچہ کی کمی کا رونا تو دودھ والے کے داموں کی شکایت، بجلی کے بل کی ادائیگی کی فکر، بچوں کی پڑھائی کا خرچہ۔ اس کی کمائی مختصر تھی، لگی بندھی۔ لیکن مہنگائی آسمان کو چھوتی جا رہی تھی۔ اپنا گزر بسر تو کسی طرح ہو جاتا تھا لیکن بچّے .....ان کے ستے ہوئے چہرے، اس کو اکثر بے چین کر دیتے تھے۔ کاش کوئی لاٹری ہی مل جائے اور وہ بہت سے روپئے لا کر گھر والوں کے سامنے ڈھیر کر دے۔ تاکہ ان کی خواہشات پوری ہو جائیں۔ وہ روز دعائیں مانگتا۔ مگر اس کے پاس ان خوش خیالات کے سوا کچھ نہ تھا۔ آج بھی سارا دن کام کرنے کے بعد بھی وہ اپنے افسر کو خوش نہ کر سکا۔ کیونکہ اس کا ذہن کہیں اور تھا۔ آفس سے نکل کر تھکے ہوئے قدموں سے وہ بس اسٹاپ کی طرف بڑھا۔ اتفاق سے اسے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ بس جلد ہی آ گئی اور وہ گھر کے لئے روانہ ہو گیا۔ بس کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ گرمی اور اُمس محسوس ہو رہی تھی۔ موٹے موٹے، دُبلے دُبلے لوگ، جن کے پسینے کی بو محسوس ہو رہی تھی۔ بار بار جھٹکے لگ رہے تھے۔ کنڈکٹر ٹکٹ چیک کرتا ہوا پاس سے گزرتا تھا۔ لیکن وہ اس سب سے بے نیاز اپنی فکروں میں کھویا ہوا تھا۔

'خان بازار' کنڈکٹر نے آواز دی۔ اور وہ بس سے اتر گیا۔ فٹ پاتھ پر ایک طرف آج بھی ایک ادھیڑ آدمی چھوٹی سی سفید چادر پھیلائے اپنے طوطے کے ساتھ بیٹھا تھا، جسے وہ روز وہاں دیکھتا تھا۔ پاس ہی ایک چھوٹا سا پنجڑا رکھا تھا، جو خالی تھا۔ سامنے لفافوں کی قطار لگی ہوئی تھی اور وہ آدمی اپنے طوطے کو کچھ کھلا رہا تھا۔ ساتھ ہی اس کی زبان چل رہی تھی:

''فال نکلوالو فال۔ طوطا فال نکالے گا بھئی۔ آیئے جناب اپنے نصیب کا حال معلوم کیجئے۔۔۔ کیوں مٹھو، بتاؤ گے نا؟''

یہ آوازیں اس کے لئے نئی نہیں تھیں۔ فال والا ہر روز اسی طرح کی آوازیں لگایا کرتا تھا۔ اور وہ دفتر سے واپسی پر کچھ دیر وہاں رک کر اس کی آواز کو سنتا اور کبھی کبھی سوچتا تھا کہ کیوں نا وہ بھی فال نکلوا کر دیکھے کہ اس کے نصیب میں دولت ہے یا نہیں۔ مگر اس کی ہمت نہ پڑتی۔

آج نہ جانے کیوں اس کا جی گھر جانے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ بس اسٹاپ کے قریب ہی ایک چھوٹا سا کھوکا تھا۔ وہ وہیں جا کر بیٹھ گیا اور ایک کپ چائے کا آرڈر دے کر اپنا رُخ فال والے کی طرف کر لیا۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ کوئی شخص فال والے کی طرف آتا ہے یا نہیں۔ یہ معلوم کرنے کے لئے کہ اس کے نصیب میں کیا لکھا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد چائے آ گئی اور وہ ٹھہر ٹھہر کر چسکیاں لینے لگا۔

شام کی رونق میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ لوگوں کی گہما گہمی بڑھ گئی تھی۔ فال والے کی زبان بھی تیزی سے چل رہی تھی۔ اس کا طوطا کبھی اڑ کر پنجڑے پر بیٹھ جاتا، کبھی پھدک کر نیچے آ جاتا اور سامنے پڑے ہوئے لفافوں کے سامنے چہل قدمی کرنے لگتا۔ کچھ دیر بعد اس کی چائے کی پیالی خالی ہو گئی۔ وہ بے دلی سے اٹھا۔ چائے کی قیمت ادا کی اور گھر جانے کے لئے بس اسٹاپ کی طرف جانے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ اچانک اس کے قدم ٹھٹھک گئے۔ فال والے کے پاس ایک نوجوان آ کر بیٹھ گیا تھا۔ اس نے بھی اپنے قدم تیزی سے فال والے کی طرف بڑھا دئے۔ اس کے دل میں ایک عجیب سی ہلچل پیدا ہو گئی تھی۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ اس نوجوان کی فال میں کیا نکلتا ہے۔

وہ خاموشی سے اس نوجوان کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ نوجوان نے فال والے کو ایک نوٹ تھماتے ہوئے التجا آمیز نظروں سے طوطے کی طرف دیکھا۔ فال والے نے اپنے طوطے کو کچھ کھلایا اور بولا:

''ہاں میاں مٹھو، صاحب کی فال نکالو..... بیٹے..... فال نکالو'۔ طوطا اُچک کر لفافوں کے پاس گیا۔ اور ایک لفافہ اپنی چونچ سے کھینچ کر قطار کے باہر کر دیا۔ اور اپنے پنجڑے پر جا کر بیٹھ گیا۔ اور ٹکر ٹکر نظریں گھما کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ فال والے نے لفافے کو اٹھایا اور اس کی عبارت کو نہایت ہی مسرت سے زور سے پڑھ کر سنایا۔

''بہت جلد ہی تمہیں کوئی خوشخبری ملنے والی ہے۔ دولت تمہارے قدم چومے گی۔ تمہارے گھر کی طرف رواں ہے۔''

نوجوان کا چہرہ فرط مسرت سے کِھل اٹھا جیسے اسے قارون کا خزانہ مل گیا ہو۔ وہ اچھلتا ہوا بس اسٹاپ کی طرف چلا گیا۔

'کتنا خوش قسمت ہے یہ نوجوان'۔ اس نے نوجوان کی طرف ستائش بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے سوچا۔ ''میں بھی کل پیسے لے کر آؤں گا اور فال نکلواؤں گا۔ مگر پیسے آئیں گے کہاں سے؟ شاید کسی دوست یا دفتر کے ساتھی سے ادھار لینا پڑیں گے۔'' ابھی وہ اپنے خیالات میں غرق دو قدم آگے بڑھا ہی تھا، کہ اچانک ایک شور اٹھا۔ بس اسٹاپ کے قریب لوگوں کا ہجوم جمع تھا۔ ہر طرف سے لوگ اسی جانب دوڑ رہے تھے۔ وہ بھی تیزی سے قریب پہنچ گیا..... پھر جیسے اس کے دل نے دھڑکنا بند کر دیا ہو۔ وہی خوش رو، کم سن نوجوان، جو ابھی اپنی فال نکلوا کر آیا تھا زمین پر خون میں لت پت پڑا تھا۔ ایک آدمی نے بتایا کہ وہ نوجوان سڑک کراس کرتے ہوئے ایک کار سے ٹکرا گیا۔ کار والا اسے بے جان پڑا چھوڑ کر بھاگ گیا ہے۔

اس کی کچھ سمجھ میں نہ آیا وہ کیا کرے۔ وہ گھبرا کر مجمع سے باہر نکل آیا اور فٹ پاتھ پر اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر قبل کا سارا منظر اس کی نظروں کے سامنے گھوم رہا تھا۔ فال والے کی آوازیں: ''طوطا فال نکالے گا۔ آیئے جناب اپنے نصیب کا حال معلوم کر لیجئے۔ ہاں میاں مٹھو فال نکالو..... فال نکالو..... بہت جلدی تمہیں کوئی خوش خبری ملنے والی ہے۔ دولت تمہارے قدم چومے گی۔ تمہارے گھر کی طرف رواں ہے.....'' فرط مسرت سے نوجوان کے چہرے کا کھلنا۔ خوشی سے اچھلتے ہوئے بس اسٹاپ کی طرف بڑھنا۔۔۔ اور پھر اسے ایسا لگا جیسے دور کہیں سے ہلکی ہلکی آوازیں آ رہی ہیں اور بڑھتی جا رہی ہیں، قریب آتی جا رہی ہیں گونج رہی ہیں: ''اللہ اکبر! اللہ اکبر!'' اور کہہ رہی ہیں:

''واقعی اللہ ہی سب سے بڑا ہے۔ طوطا بھی اللہ ہی کی تخلیق ہے۔ اللہ کے بھید اللہ ہی جانتا ہے''۔

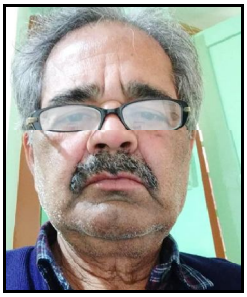
تھوڑی دیر کے بعد وہ وہاں سے اٹھا اور اپنے گھر کی طرف چل دیا۔ پیچھے فٹ پاتھ سے آواز آ رہی تھی:

''طوطا فال نکالے گا بھئی..... طوطا فال نکالے گا.....''

☆☆☆

Hindenburgdamm 46,12203 Berlin Germany

مستجاب شیلی



زمین کے فرشتے

فروری کے اواخر تک عموماً موسم گلابی ہو جاتا ہے۔ اس بار بھی ایسا ہی ہوا۔ برفیلی سرد ہوائیں اور سُن کرنے والی ٹھنڈ ختم ہو چکی تھی۔ دوپہر میں دھوپ برداشت سے باہر ہونے لگی۔ صبح شام کی ٹھنڈ باقی رہ گئی تھی۔ یا یوں کہئے کہ رات سے صبح تک موسم میں خنکی بڑھی رہتی تھی۔

ہفتے کی رات کو اعجاز الحسن کے دوست کا ولیمہ تھا۔ جس بارات گھر میں پروگرام تھا، وہ پرانے شہر سے کئی کلو میٹر دور نئے شہر میں واقع تھا۔

کئی سال سے نیا شہر ریلوے لائن کے اُس پار بڑی خوبصورتی سے بسایا جا رہا تھا۔ پرانا شہر لائن کے اس طرف گھنی آبادی، تنگ گلیوں اور چھوٹی سڑکوں والے بازاروں کی شکل میں تھا۔

اعجاز ل کا اپنے شہر کے بے فکروں میں شمار ہوتا تھا۔ تین بھائیوں اور ایک بہن میں وہ سب سے چھوٹا تھا۔ بہن بھائی سب شادی شدہ اور بچوں والے تھے اور وہ کنوارہ۔

رات کے تقریباً آٹھ بجے اس نے سوٹ پہنا، ٹائی باندھی اور قد آدم آئینے کے سامنے، تھوڑا ترچھے ہو ہو کر اپنے آپ کو دیکھتے ہوئے ذرا سینٹ اسپرے کیا، باہر آ کر موٹر سائیکل نکالی اور شادی گھر کے لئے روانہ ہو گیا۔ موسم کافی خوشگوار تھا۔

بارات گھر کا ہال اے سی تھا۔ اندر پہنچا تو دوستوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اس کے دوستوں کا گروپ الگ ایک کونے میں جما ہوا تھا۔ چٹکلوں، پھبتیوں اور قہقہوں کا دور چل رہا تھا۔ وہ بھی شامل ہو گیا۔ کافی دیر تک یہ سلسلہ چلتا رہا پھر طرح طرح کے لذیذ کھانوں کا لطف اٹھایا۔ دیر رات دولہا کی جیب میں مبارکی کا لفافہ ٹھونس کر واپسی کے لئے باہر نکلا تو موسم بدل رہا تھا۔ چاند اور بادلوں کے بیچ آنکھ مچولی شروع ہو چکی تھی۔ ہوا تیز و خنک ہو گئی تھی۔ اس نے سرعت سے موٹر سائیکل نکالی اور اس سے پہلے کہ موسم مزید بگڑ جائے، وہ گھر کے لئے روانہ ہو گیا لیکن موسم اس کی سوچ سے زیادہ تیزی سے بدلتا چلا گیا اور بارش شروع ہو گئی لیکن اس نے موٹر سائیکل نہیں روکی۔ جلد سے جلد گھر پہنچنے کی کوشش کرنے لگا۔ گھر پہنچتے پہنچتے وہ تر بتر ہو چکا تھا اور ٹھنڈ جیسے اس کے اعصاب میں سرائیت کر گئی تھی۔ گھر پر بڑی بھابی جاگ رہی تھیں۔ انھوں نے فوراً ہیٹر جلایا اور چائے بنا دی تا کہ جلدی سے کپڑے بدل کر وہ ہیٹر کے سامنے بیٹھ جائے اور چائے پی لے۔ یہ سب کچھ ہوا لیکن بھیگنا، ٹھنڈ اور سرد ہوائیں اپنا کام کر چکی تھیں۔ لرزش دور نہیں ہوئی۔ دو تین گھنٹوں کے اندر ہی اسے تیز بخار ہو گیا۔

رات جیسے تیسے کٹی۔ صبح دیر تک پڑا رہا۔ نہ صرف بخار اور بڑھ گیا تھا بلکہ ساتھ میں شدید نزلہ بھی ہو گیا۔ دونوں بڑے بھائیوں نے باری باری مزاج پرسی کی۔ بڑے والے بھائی ریاض الحسن نے فوراً ڈاکٹر کو دکھانے کا مشورہ دیا۔ آج اتوار تھا۔ گھر سے نکلتے نکلتے گیارہ سے زیادہ بج گئے۔ بارش تھم گئی تھی لیکن بادلوں کی آواجاہی اور تیز و تند ہوا بدستور تھی۔ کسی وقت بھی موسم پھر بدل سکتا تھا۔

جس ڈاکٹر کو یہ لوگ عموماً دکھاتے تھے وہ ان کے گھر سے بہ مشکل ایک کلو میٹر دور تھا۔ ہوا کی تیزی اور ٹھنڈ کو دیکھتے ہوئے انھوں نے رکشہ یا آٹو رکشہ کرنا مناسب نہیں سمجھا کہ اور زیادہ ہوا لگے گی۔ پیدل ہی خراماں خراماں چل دیئے۔ گھر سے تھوڑی ہی دور چلے ہوں گے کہ برابر والی گلی سے ابرار چچا نکل رہے تھے۔

''میاں ریاضل! کیسے ہو بھئی؟ ارے..... اسے اعجاز ل کو کیا ہوا؟ اس کا تو منہ لال ہو رہا ہے۔ اور یہ شوں شوں.....؟''

''جی چچا جان! رات ایسے..... ایسے ہوا؟'' ریاض الحسن نے پچھلی رات کا واقعہ سنایا۔ ''اب ڈاکٹر کے یہاں جا رہے ہیں۔'' یہ بھی کہہ دیا۔

''یہ کیا حماقت ہے میاں؟ آج کل کے نوجوان بھی بس کچھ مت پوچھو'' ابرار چچا بولے ''ذرا سی چھینک کیا آ گئی کہ فوراً ڈاکٹر کے یہاں..... ارے بھئی! کیا تمہیں نہیں معلوم کہ آج کل کچھ ڈاکٹر کیسے لوٹ مار کر رہے ہیں؟ غریبوں کو کھسوٹ کر اپنے بڑے بڑے اسپتال اور کوٹھیاں بنوا رہے ہیں۔ ارے میاں! گھر میں آٹے کی بھوسی ہوگی۔ کس گھر میں نہیں ہوتی؟ ایک دو روپے کی ملہٹھی لے آؤ۔ تین چھٹانک پانی میں ایک گانٹھ ملہٹھی چھیت کر ڈالو، تھوڑا نمک، تھوڑی بھوسی اور چھ سات کالی مرچ ڈال کر ابالو اور چھان کر پی لو۔ دن میں تین بار ایسے ہی پکا کر پیو اور لحاف میں لیٹ جاؤ۔ میاں دو دنوں میں ٹھنڈ، نزلہ، بخار سب نہ بھاگ جائیں تو میرا نام بدل دینا۔''

''جی چچا جان۔ ٹھیک ہے۔ ریاض الحسن بولے اور بے صبری سے ابرار چچا کے آگے بڑھ جانے کا انتظار کرنے لگے۔ پھر خاصی نصیحت کرنے کے بعد وہ آگے بڑھ گئے۔ غنیمت تھا کہ ابرار چچا کو ان سے مخالف سمت میں جانا تھا۔ سکون کی سانس لے کر دونوں بھائی آگے

105، بیگم سرائے خورد، امروہہ۔ 244221
فون: 09897103834
shelle.mustajab@gmail.com

بڑھے۔تھوڑی ہی دور چلے تھے کہ سبحان دادا جھکے ہوئے لاٹھی کے سہارے جلدی جلدی سامنے سے چلے آرہے تھے۔ان دونوں پر نظر پڑی تو سیدھے انہیں کے پاس آکر رکے۔

''بھئی آج بہت دنوں بعد تم دونوں بھائیوں کو ساتھ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی۔خدا بہتر جانتا ہے کہ میں جب بھی کہیں بھائیوں میں خلوص ومحبت دیکھتا ہوں تو دل باغ باغ ہوجاتا ہے۔اللہ ایسی محبت سے تمام بھائیوں کو نوازے۔مگر یہ اعجازل کو کیا ہوا ہے؟ یہ منہ پر رومال کیوں رکھا ہوا ہے؟اور یہ آنکھوں سے پانی بہہ رہا ہے۔''

ریاض الحسن نے ناگواری سے ماتھے پر ہاتھ رکھا لیکن فوراً ہی ہٹالیا کیوں کہ یہ بیزاری جیسی حرکت بزرگوں سے بظاہر بدتمیزی داخل ہوسکتی تھی۔انھوں نے ایک بار اور سارا ماجرا سبحان دادا کو حتی الامکان مختصر کرکے بتایا۔

''تو پھر اب کہاں جارہے ہو؟'' دادا نے پوچھا۔

''ڈاکٹر کو دکھانے۔آج اتوار ہے۔اور ڈاکٹر دوپہر تک ہی ملتے ہیں۔'' ریاض الحسن نے بتایا تاکہ دادا جلدی سے پیچھا چھوڑ دیں۔

''اوہو.....اوہو..... ارے بھئی! ڈاکٹر واکٹر کیا کرے گا اس میں؟ یہ بھی کوئی تکلیف ہے بھلا؟ لاحول تو بھیجو ڈاکٹر پر۔ریاضل! بیٹا تو اتنا بڑا ہوا گیا۔بچوں والا ہوگیا مگر تیری یہ پیسہ پھونکنے کی بری عادت ابھی تک نہیں گئی۔ارے نالائقو! پیسے کو پیسہ سمجھو اور اس کی قدر کرنا سیکھو۔فضول خرچی سے ہمیشہ بچو۔زندگی کا کچھ پتہ نہیں کہ کتنی بڑی ہے؟ پھر اکثر جانے کتنی ضرورتیں اچانک سامنے آکر کھڑی ہوجاتی ہیں۔میں تمہیں ایسا گھریلو نسخہ بتاتا ہوں جو زندگی بھر تمہارے کام آئے گا۔گرہ میں باندھ لینا۔لسوڑے کے پتے توڑ لاؤ، ایک تولہ پتے، ڈھائی چھٹانک پانی میں اچھی طرح پکاؤ۔دن میں دوبار خالی پیٹ پیو اور دیکھو اس مفت کی دوائی کا کمال۔اگر کچھ کاہلی مسلط ہو یا یہ دل نہ چاہے تو بازار سے لعوق سپستاں لے آؤ۔تولہ بھر لعوق دو چھٹانک گرم پانی میں ملا کر سوتے وقت پینا اور پھر باہر ہوا میں مت نکلنا۔دو تین دن میں ہی دیکھنا۔کیسی سردی، کیسا نزلہ بخار، سب غائب۔تب مجھے دعائیں دینا۔'' پھر پرہیز کی نصیحتوں کے ساتھ اس کی اہمیت بھی سمجھائی۔

''جی دادا! میں سمجھ گیا۔ذرا دیر ستالیں پھر لعوق سپستاں خریدتے ہوئے سیدھے گھر جائیں گے۔'' یہ کہتے ہوئے ریاض الحسن نے چھوٹے بھائی کو اشارہ کیا اور دونوں وہیں ایک دکان کے لنٹر پر بیٹھ گئے۔کنکھیوں سے دیکھا سبحان دادا کچھ دور نکل چکے تھے۔سکون کی سانس لیتے ہوئے دونوں اٹھ کھڑے ہوئے اور ڈاکٹر کی جانب چل پڑے۔دھیرے دھیرے چلتے ہوئے کچھ دور نکلے تھے کہ.....

''ارے اعجاُجل..... او للاّ..... ارے او کھلنڈرے۔'' پیچھے سے بھوریا تاؤ تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے آرہے تھے۔نام تو ان کا بھورے لال تھا مگر بھوریا تاؤ کے نام سے ہی زیادہ جانے جاتے تھے۔ پرکھوں سے اناج کی آڑھت کرتے چلے آرہے تھے۔ان کے مرحوم والد کے جگری دوست بھی تھے سو دونوں نے اوپر منہ کرکے ٹھنڈی سانسیں بھریں اور رُک گئے۔

''بیٹا ریاجُل! تو تو بالکل اپنے پتا پر گیا ہے۔تجھے دیکھتے ہی میرا من ویاکُل ہو جاوے ہے پر یو تو ابھی کھلنڈرا ہی ہے۔اب اس کا بھی بیاہ سادی کروادے تو یو بھی سدھر جاوے گا۔ پر یو..... یو کیا؟ یو تو کانپ رہا ہے.....کیا بات ہے بیٹا؟ تیرا سواستھ تو ٹھیک ہے نہ؟''

ریاض الحسن نے داستانِ سابقہ شب جہاں تک ہو سکا اختصار کے ساتھ سنائی۔یہ بھی بتادیا کہ ہم لوگ ڈاکٹر کے یہاں جارہے ہیں اور آج اتوار ہے۔

''ریاجُل! بیٹا دیکھ برا مت مانئے۔اس سمے کے بچوں کو جانے کیا ہوا ہے کہ جرا سا ماتھا کیا گرم ہوا کہ چلو ڈاکٹر پہ، میرے گھر بھی یوای حال ہے۔دیکھ بیٹا! میں تم میں اور اپنے بچوں میں کوئی انتر نہیں سمجھتا۔تو ایسا کر للاّ، میرے گھر چلا جا۔اپنی تائی کو اپنا دکھ بتا کر تلسی کے پتے مانگ لیو۔میرا نام مت لیو ورنہ وہ سانجھ کو میرا پیچھا لے لیوے گی۔تمہاری تائی تلسی کا پودا کسی کو چھونے نا دیتی۔ پر دوا کے نام پہ دے دیوے ہے۔پچیس گرام پتے اور سات کالی مرچ جرا سے پانی میں باریک پیس کر چنے کے بروبر گولی بنالیو۔ایک ایک گولی تاجے پانی سنگ صبح سام لیو۔تم کھودی ڈاکٹر کو بھول جاؤ گے۔'' پھر احتیاط کی لمبی وارننگ دینے لگے۔

''ٹھیک ہے تاؤ جی۔ہمیں کیا پتہ تھا کہ آپ اتنا بڑھیا علاج جانتے ہیں۔ہم ایسا ہی کریں گے۔آپ بے فکر رہیں۔'' دونوں رُک کر کھڑے ہوگئے اور تاؤ جی کو آگے جانے دیا۔جب تاؤ خاصے آگے نکل گئے تو وہ چل پڑے۔کچھ دور چین سے چلے تو انھوں نے سکون کی سانسیں لیں۔اچھا خاصہ وقت خراب ہو چکا تھا۔لیکن یہ سکون بھی زیادہ دیر قائم نہیں رہ سکا۔پتہ نہیں کدھر سے ادھارو کاکا آٹپکیں۔

''اوکم بختو! یہ کیسے اِترا اِترا کر چل رہے ہو؟'' اپنی اوڑھی ہوئی چادر سنبھال کر اعجازُل کا کھوا ہلاتے ہوئے بولیں۔وہ مزاحاً اکثر ایسے ہی بولتی تھیں۔یہ ان کا انداز تھا۔ان لوگوں کے دور دراز رشتے کی خالہ بھی ہوتی تھیں۔ادھارو کاکا شاید انھیں اس لئے کہتے تھے کہ وہ جگہ جگہ سے ادھار لے لیتی تھیں اور غلطی سے بھی ادائیگی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔تاہم لوگ عموماً انھیں معاف کر دیتے تھے کیوں کہ اولاد نہ ہونے کی وجہ سے ان کے شوہر نے دوسری شادی کر لی تھی اور ان پر کسی قسم کی توجہ دینی قطعی بند کر دی تھی۔انھوں نے ساری عمر ایسے ہی ہنس بول کر گزار دی تھی۔شوہر یا کسی اور سے کبھی کوئی شکایت نہیں کی۔اس سب کو اپنا نصیب جان لیا لیکن وہ لوگوں کے دکھ درد میں اپنوں کی طرح بڑے خلوص سے کام آتی تھیں اور ضرورت ختم ہوتے ہی ایسے غائب ہو جاتی تھیں جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔سارا علاقہ ان کا اپنا تھا۔سب انھیں جانتے تھے۔

''جوانمرے یہ تیرا ہاتھ منہ پہ کیوں دھرا ہوا ہے؟'' وہ کلائی پکڑ کر ہاتھ ہٹانے لگیں جو اعجازل نے رومال سے اپنی ناک ڈھکنے کے لئے رکھا ہوا تھا جس سے نزلہ بہہ رہا تھا۔''ارے بدذات! تیرا تو پنڈا پھُنک رہا ہے اور تو تو لرز رہا ہے۔'' انھوں نے منہ سے ہاتھ ہٹانے کے لئے کلائی پکڑی تھی پھر فوراً ہی کلائی چھوڑ کر ماتھا چھو کر دیکھا۔''اتنے بخار میں تو اِسے لے کر ہوا میں کیوں پھر رہا ہے؟ چلو دونوں فوراً گھر جاؤ۔میں ابھی نیم کی کونپلیں لے کر آتی ہوں۔تجھے پکا کر پلاؤں گی۔ڈرنا مت، شکر سے میٹھا کر کے دونگی۔میں بس گئی اور آئی۔تم دونوں سیدھے گھر جانا۔''

''جی..... کا کا جی۔'' اعجازل مزید ایک ٹھنڈی

سانس لیتے ہوئے بولا۔ ''بھائی مجھے کچھ چکر سا آ رہا ہے۔'' اعجازل چلاتو اسے سر چکراتا ہوا سا محسوس ہوا۔

''تو فکر مت کر۔ اپنا بوجھ مجھ پر ڈال دے۔'' ریاض الحسن نے اس کی دوسری بغل میں ہاتھ ڈال کر کس کے پکڑ لیا اور آگے چلے۔ سامنے مین روڈ تھا۔ جس پر بائیں جانب مڑنا تھا۔ کچھ ہی دور چل کر سڑک کے اُس پار ڈاکٹر پی۔کے۔اوستھی (ایم۔ڈی میڈیسن) کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ ابھی وہ آگے بڑھ ہی رہے تھے کہ مین روڈ سے گنپت بابو اپنی طرف کو مڑتے ہوئے دکھائی دیئے۔ جس ڈگری کالج میں اعجازل پڑھتا تھا اس میں وہ کلرک تھے اور اسے اچھی طرح جانتے تھے۔ دیکھتے ہی لپک کر ان کی طرف آئے۔ آتے ہی گویا ہوئے۔

''ارے اعجاجل! کیا ہوا؟ کل تک تو تو اچھا بھلا تھا'' پھر چھو کر دیکھا۔ ''اوہو۔۔ یار تجھے تو تیج بکھار ہے، پر جا کہاں رہے ہو تم لوگ اور یہ سب کیسے ہو گیا؟''

مجبوراً مختصر روداد شبِ گزشتہ، بمع سردی و بخار، ہوٹل تا خانۂ اعجاز الحسن ایک بار اور بتانی پڑی۔ ''اب ڈاکٹر اوستھی کے یہاں جا رہے ہیں۔'' ریاض الحسن بیزاری سے بولے۔

''ڈاکٹر اوستھی..... چہ..... چہ..... چہ لگتا ہے تم ڈاکٹروں کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے۔ میں نے ایک ہسپتال میں اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ مرت لوگ بھی کئی کئی دن تک اس لئے آئی۔سی۔یو میں رکھے جاتے تھے کہ ہاسپٹل کا بل بنتا رہے اور روگی کے گھر والوں کو دھوکے میں رکھا جاتا تھا کہ روگی ابھی جیوت ہے۔ میں نے کچھ سمے پہلے ایک بار یہ بھی دیکھا کہ ڈاکٹر نے کیول اس کارن بچے کے ڈرپ نہیں لگائی کہ اس کے ماتا پتا کے پاس پورے پیسے نہیں تھے۔ کچھ گھنٹوں میں وہ بچہ میرے سامنے ہی مر گیا۔ اس سمے میرے پاس بھی اتنے روپے نہیں تھے ورنہ بھگوان کسم وہ بچہ نہیں مرتا۔ ایسے ڈاکٹروں کی سا ہوکاری روگیوں سنگ اتیاچار پر نر بھر ہے۔ میری رائے میں تو تم لٹنے کے بجائے کچھ اور ہی سوچ لو۔ اور یہ اوستھی تو بالکل بیکار ڈاکٹر ہے۔ اگر ڈاکٹر کو ہی دکھانا ہے تو اچھا ہے کہ سرکاری اسپتال چلے جاؤ۔'' گنپت بابو ڈاکٹروں کے بارے میں بہت بری رائے دے کر چلے گئے۔

دونوں ذہنی طور پر تھک چکے تھے لیکن ڈاکٹر اٹھ کر نہ چلا جائے، اس ڈر سے زیادہ تیزی سے چل پڑے۔ آخر کار وہ اس جگہ پہنچ ہی گئے جہاں سڑک پار سامنے ڈاکٹر اوستھی کا کلینک تھا لیکن مین روڈ پر ٹریفک..... خدا کی پناہ۔ پھر سڑک پار کرنا وہ بھی ایسے مریض کے ساتھ جس کا سر چکرا رہا ہو۔ بڑی مشکل سے انتظار کرتے کرتے انھیں ٹریفک میں کچھ فاصلہ دکھائی دیا اور سڑک پار کرنے لگے لیکن وہ جلدی میں اُس گاڑی کو نہیں دیکھ پائے جو انتہائی تیز رفتاری سے انہیں کی طرف آ رہی تھی۔ اس کے بریک چرچرائے اور رکتے رکتے بھی وہ اعجازل سے ٹکرا ہی گئی۔ اعجازل گر پڑا۔ اس کے کافی چوٹ آئی۔ ریاض الحسن غصے سے آگ بگولہ ہو گئے۔ انھوں نے کار ڈرائیور کا کالر پکڑ کر باہر کھینچ لیا اور مار پیٹ شروع ہو گئی۔ کچھ اور لوگ بھی اکٹھے ہو گئے اور ڈرائیور کو پیٹنے لگے۔ اتنے میں کہیں سے دو تین پولیس والے آ گئے اور کار ڈرائیور کو اس کی گاڑی سڑک کے کنارے پارک کروا کر پکڑ لے گئے۔ ان دونوں سے کہا کہ تھانے آ کر تحریر دینی ہے۔ ڈاکٹری کروا کر رپورٹ لاؤ۔ ایک پولیس کانسٹیبل ان کے ساتھ ہو گیا۔

کسی طرح اعجازل کو سنبھال کر سڑک پار کی۔ ڈاکٹر اوستھی کے یہاں داخل ہو ہی رہے تھے کہ پہاڑی چوکیدار بہادر کی آواز آئی۔

''اے بائی، کدر جاتا، اندر نئیں جانے کا۔ ڈاکٹر بابو نئیں اے۔ چلا گیا۔''

ڈاکٹر اوستھی اتوار کو دو پہر دو بجے تک بیٹھتے تھے۔ سامنے گھنٹہ لگا ہوا تھا۔ اس میں دو بج کر انتالیس منٹ ہو رہے تھے۔

دونوں بھائیوں نے آٹو رکشہ کی اور دیوان جی کے ساتھ سرکاری اسپتال روانہ ہو گئے۔ وہاں پر بنا کسی چھٹی کے چوبیس گھنٹے کی سروس تھی۔ ڈاکٹری رپورٹ لے کر تھانے بھی جانا تھا۔

ہسپتال میں چیک اپ ہوا تو اعجازل کے ایک جانب کا کھوا، کہنی اور کولہا پیچھے کی طرف سے اچھے خاصے چھل گئے تھے چنانچہ سردی، بخار اور گھسٹ لگ جانے کی دوائیاں مل گئیں۔

ڈاکٹری رپورٹ کے لئے معلوم ہوا کہ اس وقت ڈاکٹر جا چکے ہیں ابھی دیر لگے گی۔ دوسرے ڈاکٹری رپورٹ یونہی نہیں مل جاتی۔ کچھ روپے خرچ کرنے پڑتے ہیں۔ انھوں نے جھوجھل میں کوئی پیسہ خرچ نہیں کیا۔

تھانہ پہنچے تو شہر کے ایک مشہور خدائی فوجدار کار ڈرائیور کی حمایت میں پہلے سے موجود تھے۔ انھوں نے سمجھا بجھا کر اور کچھ سختی سے بذریعے گھورا گھاری تھوڑی تنبیہہ کے ساتھ بنا کوئی دیر کئے فوراً فیصلہ کرا دیا۔

دونوں گھر واپس آ گئے اور ایسے سکون کی لمبی لمبی سانسیں لیں جیسے طویل مسافت طے کر کے کئی دن بعد، کسی بڑے عذاب سے بچ کر گھر پہنچے ہوں اور تھکن سے چور چور ہو گئے ہوں۔

''جان بچی سو لاکھوں پائے۔ لوٹ کے بدھو گھر کو آئے''

تھوڑی دیر لحاف میں بیٹھ کر دوائی کھانے سے پہلے ہی اعجازل کی لرزش ختم ہونے لگی۔

ہوا پھر تیز ہو گئی۔ بادلوں کی سیاہی گہری ہونے لگی اور بوندا باندی پھر شروع ہو گئی تھی۔ ☆☆

پبلی کیشنز ڈویژن کی مطبوعات اور رسائل و جرائد حاصل کرنے کے پتے

● پبلی کیشنز ڈویژن، سوچنا بھون، سی جی او کمپلیکس، لودھی روڈ، **نئی دہلی**۔3 (24365610) ● 701، سی ونگ، کیندریہ سدن، بیلا پور، **نوی ممبئی** ۔14 (27570686) ● 8 ایسپلینیڈ ایسٹ، **کولکاتا**۔69 (22488030) ● اے ونگ، راجہ جی بھون، بسنت نگر، **چنئی**۔090 (24917673) ● پریس روڈ، نزد گورنمنٹ پریس، **ترو اننت پورم**۔1 (2330650) ● بلاک نمبر 4، فرسٹ فلور، گرو کلپ کمپلیکس ایم جی روڈ، نامپلی، **حیدر آباد**۔1 (24605383) ● فرسٹ فلور، ایف ونگ، کیندریہ سدن، کورا منگلا، **بنگلور**۔34 (25537244) ● بہار اسٹیٹ کوآپریٹو بینک بلڈنگ، اشوک راج پتھ، **پٹنہ**۔4 (2301823) ● ہال نمبر 1، سیکنڈ فلور، کیندریہ بھون، سیکٹر H، علی گنج، **لکھنؤ**۔24 (2325455)

غـــــزلـــــیں

کرشن کمار طورؔ



کہاں پہ رکھی تھی ہم نے کہاں سے نکلی ہے
یہ ایک آگ سی جو آسماں سے نکلی ہے

ہوا ہے جو بھی یہاں اب مجھی سے ہے منسوب
جو بات نکلی ہے میری زباں سے نکلی ہے

زمین دل اسی باعث ہوئی ہے پھر سرسبز
یہ نہر غم کسی آب رواں سے نکلی ہے

تمہارا نام مری ذات سے ہوا مشہور
تمہاری بات مری داستاں سے نکلی ہے

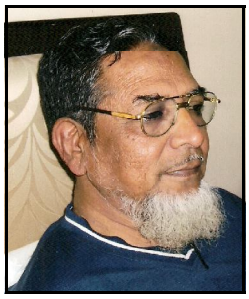
جو مٹ چکی تھی کسی طرح پھر وہی قربت
تمہارے عشق میں آہ وفغاں سے نکلی ہے

یہ بات صاف ہے گزرا ہے اب یہاں سے کوئی
یہ گرد راہ کسی کارواں سے نکلی ہے

ضرور ہوگا کوئی اس کا حل جہاں میں طورؔ
یہ شعلگی جو کہ تیرے بیاں سے نکلی ہے

134/E، کھنیارا روڈ، دھرم شالہ، 15 (ہماچل پردیش)
krishankumartoor@gmail.com

ڈاکٹر رؤف خیر



گزرنے والے ٹھہر کر بغور دیکھ مجھے
میں اپنے آپ میں ہوں ایک دَور دیکھ مجھے

میں آنے والی رُتوں کی بھی اک امانت ہوں
سلیقہ مند روایت بطور دیکھ مجھے

یہ کہہ رہا ہے خرابہ نگاہِ عبرت سے
میں ہوں نشانیِ صد ظلم و جور دیکھ مجھے

توقعات کا آئینہ پاش پاش سہی
ترے بغیر بھی زندہ ہوں اور دیکھ مجھے

پڑے ہوئے مرے پیچھے ہزار دشمن ہیں
میں بے قرار ہوں بے غارِ ثور دیکھ مجھے

زبانِ حال سے کہتی ہے یادگارِ ہنر
نہ ڈھونڈ خیرؔ کہیں اور ۔ اور دیکھ مجھے

موتی محل، گولکنڈہ، حیدرآباد۔500008
فون:9440945645

ماجد علی کاوش



نہ ہوا بدل رہی ہے نہ سماں بدل رہا ہے
اس عجیب کشمکش میں جو ہے ہاتھ مَل رہا ہے

نہ تو شادماں ہیں چہرے نہ کہیں ہنسی لبوں پر
کوئی خوف ہے جو ہر دم دل وجاں میں پل رہا ہے

یہ عجب سی کسمپرسی یہ جمود یہ خموشی
پس پردہ زندگی میں کوئی کھیل چل رہا ہے

تری بے رخی کا شکوہ نہ گلہ ہے دوریوں کا
وہ ہے شک کے دائرے میں جو قریب چل رہا ہے

تیرے گیسوؤں سے کھیلوں تجھے بار بار چھولوں
یہی کام ہے ضروری یہی کام ٹل رہا ہے

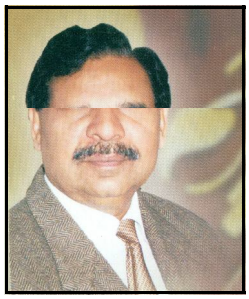
وہ بڑے بڑے مفکر یہ نئے نئے مدبر
کہیں ان سے مسئلے کا کوئی حل نکل رہا ہے

کوئی آگ تو لگی ہے جو جلا رہی ہے خرمن
نہ بھڑک رہے ہیں شعلے نہ دھواں نکل رہا ہے

51، سرویشور نگر، لوہا خان، اجمیر، 305001 راجستھان
فون:9990684195

غـــــزلـــــیں

وہاج الحق کاشف



آنکھوں میں اشک چہرے پہ رعنائیاں تو ہیں
رقصاں مرے وجود میں پروائیاں تو ہیں

سایہ نہیں تو کیا ہوا، پہنائیاں تو ہیں
صحرا میں خود کلامی کو تنہائیاں تو ہیں

حسن تمام آتشِ شبنم ہے دوستو
شبنم میں گل سے پوچھ لو، چنگاریاں تو ہیں

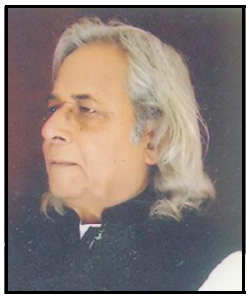
سائے میں قید ہو کے رہے تنگِ آگہی
سورج میں قد بتانے کو پرچھائیاں تو ہیں

غالبؔ نہیں، میں میرؔ و خمارؔ و قمر نہیں
زندہ رہے گا نام یہ رسوائیاں تو ہیں

ساغر نہیں ہے سامنے کاشفؔ تو کیا ہوا
رقصاں سکوتِ شام میں شہنائیاں تو ہیں

C-61، جگر کالونی، مرادآباد۔ یوپی
فون:9412650515

اشفاق نجمی



(مرحوم مظفر حنفی کی یاد میں)

کبھی زمیں تو کبھی آسماں کا حصہ ہے
مرا سفر، سفرِ دو جہاں کا حصہ ہے

سنان و خنجر و تیروسناں کا حصہ ہے
مرا وجود مرے امتحاں کا حصہ ہے

ہم اپنے سر کو بچا کر چلیں میاں کب تک
ہمارا سر کسی سنگِ گراں کا حصہ ہے

کہیں پہ خشک نظر آئے گا یہ دریا بھی
کہ میری تشنگی آبِ رواں کا حصہ ہے

وہ میرا جسم تھا تیغوں کے جو حوالے تھا
یہ میرا سر ہے جو نوکِ سناں کا حصہ ہے

جسے سنانے میں گزری ہیں سیکڑوں راتیں
وہ داستاں بھی مری داستاں کا حصہ ہے

یہ کہکشاں کی بلندی کو چھو کے آئے گا
غبارِ راہ، مرے کارواں کا حصہ ہے

غضب کا مصرع مظفرؔ نے کہہ دیا نجمیؔ
''میاں غزل اسد اللہ خاں کا حصہ ہے''

شبیب کمپیوٹر حسین آباد، حیدری چوک، کامٹی، ضلع
ناگپور۔441001، (ایم ایس)

ڈاکٹر مقصود عالم رفعت



دیتا رہا فریب سدا رہنما مجھے
منزل سے اس نے دور ہمیشہ رکھا مجھے

آغوش میں لیا جب اجل نے تو یوں لگا
جیسے لگا رہی ہو گلے دلربا مجھے

ہوتی نہیں ہے اس سے قضا عشق کی نماز
وہ شخص لگ رہا ہے کوئی پارسا مجھے

اہلِ خرد جنوں سے مرے کانپنے لگے
ہاری نہیں تھی بازی، ہرایا گیا مجھے

مشکل تھا امتحان مگر عزم تھا جواں
آخر سمندروں نے دیا راستہ مجھے

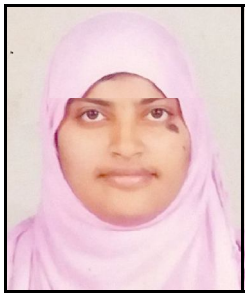
رسوائی، جگ ہنسائی، ذلالت، مفارقت
اس عاشقی سے کیا ملا اِن کے سوا مجھے

جس کی ہوئی شکست وہی کامراں ہوا
لگتا عجب ہے عشق کا یہ ضابطہ مجھے

لکھا تھا جو نصیب میں حاصل مجھے ہوا
رفعت ہو زندگی سے بھلا کیوں گلہ مجھے

پنڈول، مدھوبنی، بہار۔847234
فون:9315145062

عاتکہ ماہین



تا کہ جھوٹ کا بھرم قائم رہے!

اے صحرا میں بھٹکنے والے کمزور اور ناتواں ریت کے ذرو!
کیا تم نے کبھی سوچا ہے؟
کہ، چٹان سا مضبوط نظر آنے والا انسان بھی
کچھ معاملات میں
تمہاری طرح ہی کمزور اور ناتواں ہوتا ہے
کہ غموں کی مدھم ہوائیں بھی اس کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتی ہیں
اور سورج کی ہلکی سی روشنی بھی
اس کے اندر چمک بھر دیتی ہے
تم کبھی اس کے اندر جھانک کر تو دیکھو
جتنی گہرائی میں اترتے جاؤ گے
اس کے اندر کے خالی پن کا خوف تمہارا پیچھا کرے گا
اے کمزور اور ناتواں ذرو!
اس حقیقت کو تسلیم کیوں نہیں کر لیتے؟
کہ چٹان بھی بھربھری ریت کی مانند بکھر بکھر جاتا ہے
لیکن دنیا کی آنکھوں میں اس کی مضبوط شبیہ
اس کے بکھراؤ کو تسلیم نہیں کرتی
اور اسے خود اپنے وجود کو سمیٹنا پڑتا ہے

ریسرچ اسکالر، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
atikaamahin@gmail.com

نیلوفر پروین

شہر کا موسم

گرمی کی چلچلاتی دھوپ میں
سنسان راستوں پر بے سبب
اِدھر اُدھر بھٹکا کروں
یا جاڑوں کی برفیلی ہواؤں میں
ننگے پاؤں
ٹھنڈی سڑک پر دور تک نکل جاؤں
اتنی دور کہ
جب لوٹنا چاہوں تو گہری دھند میں
سب راستے گم ہو جائیں
اور گھر کا پتہ نہ ملے
یا جب بارش ہو اور
گھٹائیں ٹوٹ کر برسیں
تو میں
چھت کے ٹپکنے کا منظر
اپنی آنکھوں میں
قطرہ قطرہ سمیٹ لوں
لیکن یہ کیا.....؟
یہاں تک آتے آتے
ہر موسم کا انداز بدل جاتا ہے
اس شہر کے آسماں پر
برسوں سے صرف
کرفیو کا موسم ٹھہرا ہے

گاچھی ٹولہ، وارڈ نمبر 24، ارریہ، 854311، بہار
فون: 7294941132

برجیس آرزو



زلفِ وحشت

شام سے نیم خواب ہیں تارے
بامِ افلاک پر ہے خاموشی
صحنِ گلشن میں پھیلا سناٹا
گل کدے کے ہیں گل اداس، اداس
بوئے گل کیونکہ گل سے روٹھ گئی

اک تبسم ہے ہر کلی پہ ، مگر
اور بھی ابھرے زخمِ ہائے جگر
سلسلے صبر کے مرے ٹوٹے
سہمے سہمے سے ہیں سبھی بوٹے
موسمِ وصل میں جو تم روٹھے
بجھ گئے دیپ آرزوؤں کے

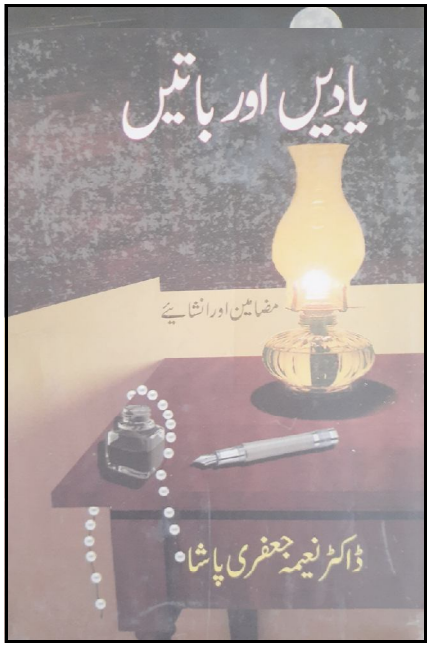
ہر طرف ایک جیسا منظر ہے
سر جھکائے کھڑے ہیں سب کے سب
ایک ہی صف میں یہ جو دیوانے
تج کے اہلِ خرد کے میخانے
باجماعت نماز کرتے ہیں
زلفِ وحشت دراز کرتے ہیں

'دلفزا' محلّہ شاہ جمعہ، پوسٹ سہسرام، روہتاس، بہار۔15
فون: 8434026111

تبصرے

☆ تبصرے کیلئے کتاب کی دو کاپیاں لازماً ارسال کریں۔
☆ ضروری نہیں کہ ہر کتاب پر تبصرہ شائع ہو۔
☆ تبصرے کے لیے ارسال کی جارہی کتاب کے سرورق کی تصویر ای میل سے بھیجیں۔
☆ تبصرے کے لیے تقاضا کر کے شرمندہ نہ کریں۔
☆ کتاب کسی بھی صورت میں واپس نہیں کی جائے گی۔

نام کتاب : یادیں اور باتیں
(مضامین اور انشائیے)
مصنفہ : ڈاکٹر نعیمہ جعفری پاشا
ضخامت : 264 صفحات
قیمت : 300 روپے
ملنے کا پتہ : ایم۔ آر پبلی کیشنز، میٹرو پول مارکیٹ، کوچہ چیلان، دریا گنج، دہلی۔
مبصر : عذرا نقوی
فون : 9958933161



ڈاکٹر نعیمہ جعفری پاشا ایک معروف ادیبہ ہیں۔ان کی تیرہ کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں جن میں کئی افسانوی مجموعے، بچوں کی کہانیوں کے مجموعے، خودنوشت، ناول، خاکے اوران کا گراں قدر تحقیقی مقالہ 'فرہنگ کلیات نظیر اکبرآبادی مع تنقید' شامل ہیں ۔ان کی تازہ ترین کتاب ''یادیں اور باتیں'' اپنے انتیس مشمولات کے اعتبار سے بہت متنوع، منفرد اور دلچسپ ہے۔انھوں نے اس میں ادبی شخصیات اور موضوعات پر مضامین اور انشائیے شامل کئے ہیں اور ایک گوشہ اپنے استاد خلیل الرحمان اعظمی کے لئے مختص کیا ہے۔مصنفہ نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں اپنی ایم۔ اے اردو کی کلاس میں دئے گئے خلیل الرحمان صاحب کے لکچرس کو نہ صرف بغور سنا تھا بلکہ لکھ کر محفوظ بھی کرلیا تھا۔انگریزی ادب سے متعلق یہ لکچرس بقول مصنفہ کے اردو والوں خصوصاً طالب علموں کے لئے سوغات کے طور پر اس کتاب میں پیش کئے ہیں۔

مصنفہ نے کتاب کے پیش لفظ میں مضمون نگاری کے حوالے سے کچھ بہت اہم سوال اٹھائے ہیں۔ان کا کہنا ہے کہ مضمون نگاری جو ایک زمانے میں اسکولی نصاب کا اہم جزو ہوتی تھی وہ اب معدوم ہوتی جارہی ہے۔وہ لکھتی ہیں'' آج کل اعلی سطح پر بھی مضمون نگاری کا نام سننے میں نہیں آتا۔سمیناروں میں مقالے پڑھے جاتے ہیں۔اور جب ان مقالات کے مجموعے شائع ہوتے ہیں تو انھیں تنقید کا نام دے دیا جاتا ہے....حالانکہ تنقید چیزے دیگر است''۔اس کتاب میں نعیمہ کے وہ مضامین شامل ہیں جو کسی سیمنار، ورک شاپ یا فرمائش پر نہیں لکھے گئے لیکن ان میں سے چند رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔نظیر اکبرآبادی پر اس کتاب میں دو مضامین شامل ہیں' برج دیش کا سچا عاشق' اور ' نظیر اکبرآبادی کے فارسی خمسا جات اور ترجمہ۔ فارسی سے ترجمہ خود مصنفہ نے کیا ہے۔نعیمہ ایک علمی اور صوفی گھرانے سے تعلق رکھتی ہیں ۔کتاب میں شامل دو مضامین اہل خاندان کے بارے میں ہیں۔ایک مفصل مضمون اپنے تایا میکش اکبرآبادی کی شخصیت اور شاعری پر ہے اور دوسرا ان کے والد علی شاہ قمر جعفری کی شاعری سے متعارف کراتا ہے جس میں نعیمہ نے اپنی والدہ نجمہ جعفری کا بھی ذکر کیا ہے جو خود بھی صاحب دیوان شاعرہ تھیں۔'حضرت نیاز احمد بریلوی کی شاعری میں اسرار تصوف' کے عنوان سے ایک بہت معلوماتی مضمون انیسویں صدی کے ان مشہور و معروف فارسی اور اردو کے شاعر کی زندگی اور شاعری پر شامل کتاب ہے۔اس میں مصنفہ نے ان کے دیوان میں بھگتی رس اور ہندوی تمدن، روایات اور تہواروں سے متعلق نظموں، ہندی دوہوں اور کبت کے کئی حوالے دیئے ہیں۔'ایک یادگار تاریخی مشاعرہ' جسے رپوتاژ کہیں یا مضمون، ادبی اور تاریخی اعتبار سے بہت خاصے کی چیز ہے۔اس میں سن 1933 میں جے پور میں البرٹ ہال میں ہوئے ایک عظیم الشان آل انڈیا مشاعرے کی روداد ہے جو شاہ جارج پنجم کی سلور جوبلی اور راجہ مان سنگھ ثانی کی تخت نشینی کے جشن کی تقریبات کا حصہ تھا۔اس مشاعرے کے کنوینر مصنفہ کے والد تھے جو اس وقت راجستھان کی سول سروس میں ایک اہم عہدے پر تھے۔ یہ طرحی مشاعرہ تین شاموں پر چار نشستوں اور چھتیس گھنٹوں پر محیط تھا اور اس میں تقریباً ایک سو ستر شعرا نے شرکت کی تھی۔مصنفہ نے اس تاریخی مشاعرے کا بیان کچھ اس انداز سے کیا ہے گویا آنکھوں دیکھا حال لکھ رہی ہوں۔نسائی ادب سے متعلق تین مضامین ہیں جن میں مسرور جہاں، امرتا پریتم کے فن پر مفصل تبصرہ ہے اور ایک مضمون میں دہلی کی سولہ اہم افسانہ نگار خواتین کا مختصر تذکرہ ہے۔

نعیمہ ایک افسانہ نگار ہیں، بی اے اور ایم اے کی پرائیوٹ طور پر امتحان دینے والی طالبات کے لئے کوچنگ سینٹر بھی چلاتی ہیں اور علم و ادب پر بھی گہری نظر رکھتی ہیں۔اپنی بات کو سہل اور سلیس انداز میں کہنے کا فن بھی جانتی ہیں ۔اس لئے اس کتاب میں شامل مختلف موضوعات پر ان کی تحریریں بہت ریڈ ایبل ہیں، لیکن زبان و بیان کے اعتبار سے بھی بہت مستند ہیں۔

نام رسالہ :یک موضوعی مجلّہ:اندازبیاں
میڈیکل ڈاکٹروں کی ادبی خدمات
مدیر : حقانی القاسمی
ضخامت : 544 صفحات
قیمت : 500 روپے
ناشر : عبارت پبلی کیشن، نئی دہلی
مبصر : محمد شارب ضیاء رحمانی
فون : 8750258097

یک موضوعی مجلّہ اندازبیاں کا نیا شمارہ میڈیکل ڈاکٹروں کی ادبی خدمات پر مشتمل ہے۔انفرادیت اور نئ



راہ تلاش کرنا تخلیق کار کا خواب ہوتا ہے۔منزل نئی ہو اور مشکل ترین تو سفر کے لیے جگر چاہیے اور جہد مسلسل بھی۔حقانی، صاحب طرز ادیب بھی ہیں اور نئی راہوں کے باعزم مسافر بھی۔منفرد اسلوب، جدت اور اچھوتا پن ان کی پہچان ہے۔'انداز بیاں' کے سارے شمارے اسی انفرادیت کا رنگ و آہنگ لیے ہوئے ہیں۔علم و قلم سے بھرپور شخصیت جس طرح زرق و برق سے دور ہے، مجلّہ میں وہی سادگی نمایاں ہے۔یوں کہیے کہ شخصیت کا پرتو ہے۔'خواتین کی خودنوشت' اور 'پولیس کا تخلیقی چہرہ' پیش کرنے کے بعد حقانی نے 'میڈیکل ڈاکٹروں کی ادبی خدمات' کا احاطہ کیا ہے جس میں ادبی دنیا اور طبی دنیا کے ربط کو واضح کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ادب اور سماج کا رشتہ جس طرح گہرا ہے، سماج بھی طبی سہولیات کے بغیر ادھورا ہے۔طب اور ادب باہم مربوط ہیں۔ادب سماج کا عکاس ہے تو طب معاشرے کی ضرورت۔طبیب اور ادیب دونوں سماج کی نبض ٹٹولتے ہیں۔کہنا چاہیے کہ ادیب سماجی مسائل کا ادراک کرتا ہے، طبیب، ان کا علاج کرتا ہے۔قدر مشترک معاشرے کی تفہیم، تشخیص اور علاج ہے۔ماہرین نے ادب اور طب کے درمیان کئی رشتے ثابت کیے ہیں۔زیر تبصرہ مجلّے میں ان رشتوں پر مدلل اور مفصل گفتگو کی گئی ہے۔

'ڈاکٹروں کے جذبہ خدمت کو خراج تحسین' پیش کرنے کے ساتھ یہ مجلّہ حقانی کے 'دست مسیحائی' سے شروع ہو کر 'جگر گوشہ حقانی' کے سانحہ ارتحال کی غمگین فضا کے ساتھ مکمل ہوتا ہے۔'دست مسیحائی' میں حقانی نے میڈیکل ڈاکٹروں کی اہم ادبی خدمات کا اجمالی جائزہ لیا ہے۔ادب اور میڈیکل شعبہ کے گہرے رشتے پر مدلل گفتگو کرتے ہوئے انھوں نے ثابت کیا ہے کہ ادب کو مالا مال کرنے میں میڈیکل سے وابستہ شخصیات کی قابل قدر خدمات رہی ہیں۔چنانچہ ابتدا ان الفاظ سے کرتے ہیں:

''ادب اور میڈیسین کا بہت گہرا رشتہ ہے۔دونوں ہی انسانی کیفیات کا علاج کرتے ہیں اور ان دونوں کی حیثیت معاشرے میں کارمسیحائی کی ہے۔ادب سماج کی نبض کو ٹٹول کر اس کی بیماریاں بیان کرتا ہے تو میڈیسین ان بیماریوں کی تشخیص کر کے ان کا علاج تلاش کرتی ہے۔ادب کو مالا مال کرنے یا اس کی ثروت مندی میں اضافہ کرنے میں میڈیسین کا بھی بہت اہم کردار ہے''۔(ص10)

حقانی کے ابتدایے نے ڈاکٹر گلکرسٹ، زبیر فاروق، سید مظہر عباس رضوی، حنیف ترین، اقبال احمد پیرزادہ، اشرف الحق، مسلم شہزاد، اسلم حبیب، زویا زیدی، کمل شنکر دوبے، سالک اعظم، ایس آر جھا، یونس بٹ، رشید جہاں، انور سجاد اور فیض الرحمٰن سمیت متعدد اہم اہل قلم ڈاکٹروں کے ادبی کارناموں کی مثالوں کو پیش کرتے ہوئے علم و تحقیق کا نیا باب کھولا ہے۔56 صفحات پر مشتمل اس گرانقدر تعارفی نوٹ کو ہم آنے والے مضامین کا مقدمہ کہہ سکتے ہیں۔

'مرکبات' اور 'مفردات' کے دو باب قائم کیے گئے ہیں۔مرکبات کو 'الف اور با' میں تقسیم کیا گیا ہے۔'الف' کے تحت ڈاکٹر عابد معز کے تین مضامین ہیں جن میں 'وہ جنھیں ڈاکٹر قلم کار کہا جاتا ہے'، 'اردو ادب میں ڈاکٹر طنز و مزاح نگار' اور 'جامعہ عثمانیہ کے اردو زبان و ادب پرور ڈاکٹرز' شامل ہیں۔

ہروادی کی طرح اس نئی وادی کا سفر بھی حقانی اور ان کے کارواں نے کامیابی کے ساتھ مکمل کیا ہے اور ادبی دنیا کو نیا زاویہ دینے کی کاوش کی ہے۔اس کے ساتھ ساتھ یہ مجلّہ میڈیکل ڈاکٹروں کی ادبی خدمات پر خراج تحسین ہے۔جسیم اور ضخیم ہونے کے باوجود مجلّہ کی قیمت مناسب رکھی گئی ہے۔امید نہیں، یقین ہے کہ ادبی حلقوں میں پسند کیا جائے گا۔الغرض یہ شمارہ ادب اور طب کے رشتوں کو سمجھنے اور طبیب و ادیب کی قدر مشترک پر مفصل تحقیقی دستاویز ہے۔

نام کتاب : نیا حمام (کہانیاں)
افسانہ نگار : ذاکر فیضی
ضخامت : 203 صفحات
قیمت : 250 روپے
ناشر : ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔6
مبصر : رضی شہاب
فون : 9810332595



زیر نظر کتاب 'نیا حمام' ذاکر فیضی کی کہانیوں کا مجموعہ ہے۔اس کتاب میں چند تاثرات کے علاوہ 25 افسانے اور پانچ افسانچے شامل ہیں۔ذاکر فیضی تقریباً تین دہائیاں اپنی تخلیقی آبیاری کرتے رہے ہیں اور اب مختلف ادوار میں تحریر کردہ ان کے افسانے ایک مجموعے کی صورت میں قارئین کے ہاتھوں میں ہے۔یہ ایک خوش آئند بات ہے۔

ذاکر فیضی کی کہانیاں پڑھتے ہوئے ان کی ریاضت و مشق کا احساس ہوتا ہے۔اور یہ فطری بھی ہے کیونکہ نو برس کی عمر میں شروع ہونے والے سفر کا پہلا پڑاؤ اب آیا ہے جب وہ اپنی عمر کی تقریباً چار دہائیاں گزار چکے ہیں۔اور مجھے یہاں یہ کہنے میں کوئی جھجک نہیں کہ انہوں نے اگر خود کو اس دشت کی سیاحی میں برسوں مصروف رکھا ہے تو اس کا نتیجہ بھی بہتر شکل میں سامنے آیا ہے۔ان کی

کہانیوں کا مطالعہ کرنے والا یقیناً مایوس نہیں ہوگا اور یہی ان کے اس سفر کی کامیابی ہے۔

ذاکر فیضی کی کہانیوں کے خاکے میں فلسفہ کی باریکیاں نہیں بلکہ سیدھے سادے قصے رنگ بھرتے نظر آتے ہیں۔وہ قصے جو قاری کے ساتھ دیر تک شریک سفر رہتے ہیں اور اس کے سامنے اس کے آس پاس کے حالات وواقعات روشن کر دیتے ہیں۔ یہ وہ قصے ہیں جن کے باطن میں فکر ودانش کے کئی کئی منظر نامے بنتے بگڑتے ہیں اور ان منظر ناموں میں موجودہ عہد کی ان گنت تلخ سچائیاں رقص کناں ہوتی ہیں۔ سماج کی گھنونی حقیقتیں ہوں یا سیاست کے فریب، میڈیا اور ذمہ داران میڈیا کی مردہ ضمیری ہو یا پھر چند سکوں کے عوض اپنا قلم بیچنے والوں کا بیان ، سماج میں اخلاقی انحطاط کا پہلو یا پھر سرکاری اداروں کی بے وقعتی ؛ذاکر فیضی کی اس زنبیل میں سب کچھ ہے۔

ذاکر فیضی کا بیانیہ جس زبان میں تخلیق ہوا ہے وہ روز مرہ کی زبان ہے ۔کہیں کہیں کچھ انگریزی لفظوں کا استعمال کھٹکتا بھی ہے تاہم دلچسپ پیرایۂ بیان کے سبب قاری قصے کے انجام تک پہنچنے کی دھن میں دیگر فنی پہلوؤں پر دھیان دینے سے قاصر ہوتا ہے۔

میں نے پہلے بھی کہا کہ برسوں کی ریاضت نے ذاکر فیضی کو پہلی سیڑھی پر پہنچا دیا ہے ۔ان کے اس تخلیقی سفر میں ابھی کئی پڑاؤ آنے باقی ہیں۔ مستقبل میں ان کی فنی ریاضت اور ہوگی اور ہمیں مزید دھنک رنگ کہانیاں پڑھنے کو ملیں گی۔ میں امید کرتا ہوں کہ ہمارے اس جوان افسانہ نگار کی کہانیوں کو پڑھا جائے گا، ان کی حوصلہ افزائی کے ساتھ ساتھ رہنمائی بھی کی جائے گی اور ان کے بہتر مستقبل کی دعائیں کی جائیں گی۔

نام کتاب : شعور کی رو

مصنف : سلطان آزاد

ضخامت : 120 صفحات

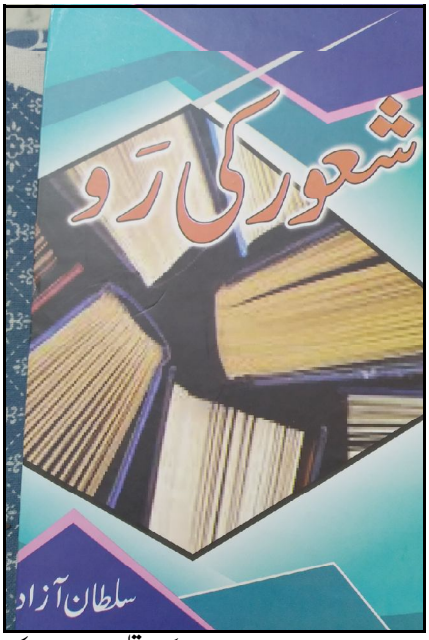
قیمت : 300 روپے

ناشر : سلطان آزاد

مبصر : جمال عباس فہمی

فون : 9392522121

مجھے جس کتاب کا تبصرہ مقصود ہے وہ ہے 'شعور کی رو' اس کے مصنف ہیں بہار کے اہم قلمکاروں میں شمار



سلطان آزاد۔سلطان آزاد ایک سرکردہ قلم کار ہیں۔انکے ضابطہ تحریر میں متعدد کتابیں آچکی ہیں اور طبع ہوکر باذوق افراد سے داد وتحسین حاصل کرچکی ہیں۔سلطان آزاد کا اسپ قلم مختلف میدانوں میں دوڑتا ہے۔وہ تحقیق وتبصرہ بھی کرتے ہیں۔تزکرہ اور تنقید بھی۔وہ افسانہ نگاری کے جوہر بھی دکھاتے ہیں۔بچوں کی دلچسپی اور معلومات کا بھی خیال رکھتے ہیں اور ترتیب و تدوین بھی فرماتے ہیں۔سعادت مندی کا یہ عالم ہیکہ انہوں زیر نظر کتاب کا انتساب اپنے استاد مرحوم سید ناصر حسین زیدی کے نام کردیا۔شعور کی رو مصنف کے مضامین کا مجموعہ ہے۔بارہ مضامین پر مشتمل اس کتاب میں تحقیقی اور تنقیدی مضامین بھی ہیں۔شعرا کی اوج فکر تک پہونچنے کی بھی کوشش کی گئی ہے۔سکھوں کے پہلے گرو نانک جی کی روحانی عرفانی اور وجدانی شاعری کے اردو ترجمے کو نئے دور کے باذوق افراد کی تسکین روح کے لئے پیش بھی کیا گیا ہے۔سرسید کی تحریک کے زیر اثر قائم ہونے والے محمڈن اینگلو عربک اسکول کے ان ابنائے قدیم کو تاریخ کے تہ خانے سے نکال کر لوگوں کے سامنے اس حوالے سے پیش کیا کہ مختلف میدانوں کے شہ سوار وہ افراد محمڈن اینگلو عربک اسکول کی دامن تربیت میں پل بڑھ کر بام عروج پر پہنچے۔سلطان آزاد کا یہ کارنامہ اگر تخلیق پزیر نہ ہوتا تو ہمیں یہ معلوم نہ ہوتا کہ یاس یگانہ چنگیزی۔علی عباس حسینی۔قاضی عبدالودود۔افضل عظیم آبادی۔نواب زادہ سید محمد مہدی۔کلیم الدین احمد۔ہندستانی اسلامی تاریخ کے ماہر سید صباح الدین عبدالرحمان اور حسن نعیم جیسی شخصیات محمڈن اینگلو عربک اسکول کی پروردہ ہیں۔

مصنف نے ایک مضمون میں جھارکھنڈ اور بہار میں طنز و مزاح کے آغاز سے لیکر ارتقا تک کا جائزہ لیا ہے۔انہوں نے ساحر لدھیانوی کی شاعری کی عوامی مقبولیت پر بھی گفتگو کی ہے اور جمیل مظہری کی نظم نگاری کا بھی بے لاگ جائزہ لیا ہے۔اس کتاب کا ایک خاص مضمون فلمی دنیا کی عظیم ہستی مینا کماری کی شاعری پر ہے۔انکا تخلص ناز تھا۔مینا کماری کی اداکاری پر تو بہت کچھ لکھا پڑھا گیا ہے لیکن ان کی شاعرانہ صلاحیتوں پر زیادہ کچھ نہیں لکھا گیا۔سلطان آزاد نے شاعری کے حوالے سے مینا کماری کی ادبی حیثیت پر گفتگو کی ہے۔ مصنف نے مینا کماری کے متعدد اشعار پیش کئے ہیں جن میں مینا کماری نے سوز دروں ظاہر کیا ہے۔مینا کماری نے اپنے جزبات کے اظہار کے لئے غزل کے ساتھ ساتھ نظم کا بھی سہارا لیا۔۔مینا کماری کی شاعری کے حوالے سیہ باتیں بھی گردش کرتی رہی ہیں کہ وہ شعرو شاعری سے شغف تو رکھتی تھیں لیکن خود انکے اندر شعر گوئی کی صلاحیت نہیں تھی۔بہرکیف یہ امر تحقیق طلب ہے۔شعور کی رو میں ایک مضمون مرزا رفیع سودا کی ہجو نگاری پر بھی ہے۔ سلطان آزاد نے اپنے استاد ناصر زیدی کی ادیب گرانہ صلاحیتوں کا ذکر کیا ہے۔ناصر زیدی کی زندگی کے کئی پہلو وہ منظر عام پر لائے۔یہ مضمون ایک سعادت مند شاگرد کا اپنے شفیق استاد کو خراج عقیدت ہے۔مصنف نے کچھ تصانیف پر اپنے ذریعے سپرد قلم کئے گئے کئی تبصرے بھی شامل کتاب کئے ہیں۔مجموعی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ شعور کی رو ایک قابل مطالعہ کتاب ہے۔

نام کتاب : جامعہ کشمیر کی اردو ادبی خدمات

مصنف : ڈاکٹر محمد یاسین گنائی

ضخامت : 1007 صفحات

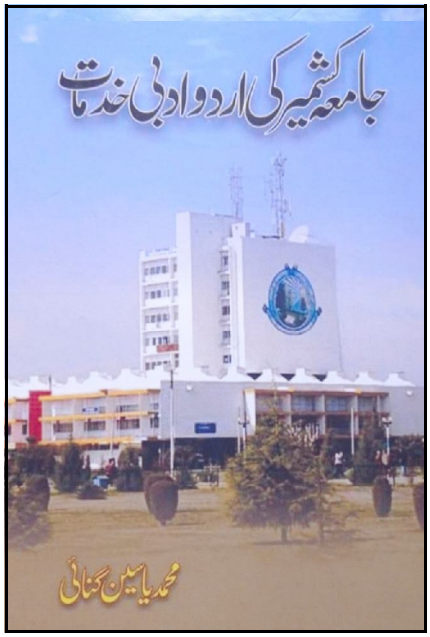
قیمت : 568 روپے

ناشر : میزان پبلشرز، بٹہ ماو سرینگر، کشمیر

مبصر : شاد سجاد

فون : 9858667464

ڈاکٹر محمد یاسین گنائی اردو ادب کے نوجوان قلم کار ہیں۔ان کے مقالوں کی کتاب ''مشک زعفران'' کے نام



سے پہلے ہی منصۂ شہود پر آئی ہے۔ اس کتاب کے بعد موصوف نے ''جامعہ کشمیر کی اردو ادبی خدمات'' کے نام سے جو کتاب لکھی ہے وہ موضوع کے اعتبار سے کافی اہمیت رکھتی ہے۔

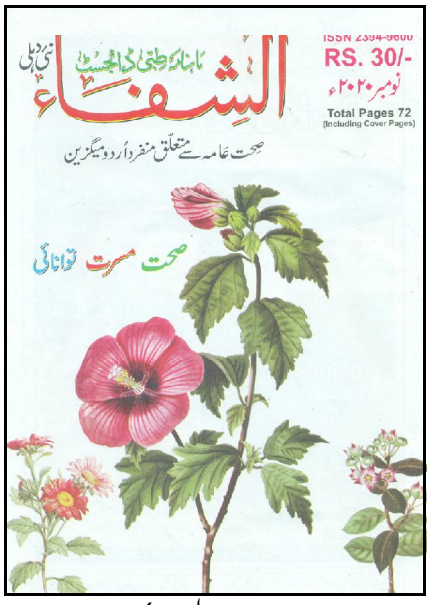
ڈاکٹر یاسین کی کتاب آٹھ ابواب پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کے پہلے باب (جامعہ کشمیر ایک تعارف) میں کشمیر یونیورسٹی کے قیام سے لے کر اس کے مختلف شعبہ جات کا بھرپور انداز میں احاطہ کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اس باب میں کشمیر یونیورسٹی سے منسلک کالجوں، یونی ورسٹی کیمپس، بی۔ایڈ کالجوں وغیرہ کا بھی گہرائی کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ مذکورہ کتاب کا دوسرا باب ''جامعہ کشمیر کا قیام و مقصد'' ہے۔ اس باب میں جامعہ کشمیر کے مقاصد اور ان کے حصول پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ کتاب کا تیسرا باب ''جامعہ کشمیر کے گردونواح میں سیاحتی، تاریخی اور مذہبی مقامات'' ہے۔ اس باب کے مطالعے سے ان مقامات کی خوب صورتی کے ساتھ ساتھ ان کا کشمیر یونیورسٹی کے ساتھ ربط و تعلق کا بھی احساس ہوتا ہے۔ زیر نظر کتاب کا چوتھا باب ''جامعہ کشمیر کا حصہ علمی و ادبی اور مذہبی و تاریخی شخصیات کے فروغ میں'' کے عنوان سے پیش ہوا ہے۔ یہ باب اس لحاظ سے اہمیت رکھتا ہے کہ اس میں کشمیر یونی ورسٹی کے مختلف اداروں، ہوسٹلوں، آڈی ٹوریموں، صدر دروازوں وغیرہ کے ناموں اور اوران کے انسلاکات وغیرہ کا ذکر بڑی دلچسپی کے ساتھ کیا گیا ہے۔ مذکورہ بالا ابواب اگر چہ ادبی چاشنی سے دور ہیں، تاہم ان سے جو معلومات بہم پہنچتی ہے اس سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا۔

ڈاکٹر یاسین گنائی کی مذکورہ کتاب کا پانچواں باب ''شعبۂ اردو جامعہ کشمیر کی ادبی خدمات'' کے عنوان کے تحت پیش ہوا ہے۔ اس میں شعبہ اردو کشمیر یونیورسٹی کے تنقیدی اور تحقیقی کارناموں پر مفصل روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس باب کے مطالعے سے موصوف کی محنت اور لگن کا اندازہ بخوبی ہوتا ہے۔ شعبہ کب وجود میں آیا، پہلا صدرِ شعبہ کون تھا اور ان کے بعد کس کس نے صدرِ شعبہ کی حیثیت سے کام کیا۔ کس پروفیسر کا تقرر کب ہوا، پہلا اسکالر کون تھا۔ اس کا موضوع کیا تھا۔ اس نے کس کی نگرانی میں مقالہ لکھا۔ اسی طرح باقی اسکالروں کی نوعیت کیا رہی۔ ان تمام معلومات کو موصوف نے کتاب میں پیش کر کے شعبہ کے حوالے سے ایک نئی تحقیق سامنے لائی ہے۔ ''نظامتِ فاصلاتی تعلیم کشمیر یونیورسٹی کی ادبی خدمات'' ڈاکٹر یاسین گنائی کی کتاب کا چھٹا باب ہے۔ اس باب میں فاصلاتی نظام تعلیم کشمیر یونی ورسٹی کی تاریخ اور اس کی ادبی اور دیگر خدمات کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ کتاب کا ساتواں باب 'اقبال انسٹی ٹیوٹ' ہے۔ سمیناروں، جریدہ، توسیعی خطبات، تحقیقی کاموں وغیرہ کے بارے میں اس کتاب میں خاصی جانکاری فراہم کی گئی ہے۔ اس ضخیم کتاب کا آٹھواں اور آخری باب ''جامعہ کشمیر کے دیگر مراکز اور شخصیات کی ادبی خدمات'' ہے۔ اس باب میں جن مراکز پر خامہ فرسائی کی گئی ہے ان میں اسلامک اسٹڈیز سینٹر، مرکز نور، شعبہ فارسی کشمیری، ہندی وغیرہ شامل ہیں۔ ان اداروں سے وابستہ قلم کاروں کی ادبی کاوشوں کو اس باب میں پیش کیا گیا ہے۔ قاضی غلام احمد، اشرف عادل، شمس الدین شمیم، رحمان راہی وغیرہ ایسے اہم نام ہیں جنھوں نے شعبۂ اردو سے دور کشمیر یونی ورسٹی کے دوسرے اداروں میں اپنے فرائض منصبی انجام دینے کے باوجود اردو ادب کی بے لوث خدمات انجام دیں۔

مجموعی طور پر ڈاکٹر محمد یاسین گنائی کی یہ کتاب کشمیر یونیورسٹی کے ماضی اور حال کو سمجھنے کے سلسلے میں نہایت اہمیت کی حامل ہے۔ اس کتاب کا ہر ایک ورق کشمیر یونیورسٹی کے در و بام اور یہاں کی علمی، ادبی اور دیگر کاوشوں کو سمجھنے میں کافی مدد دینے کی اہلیت رکھتا ہے۔

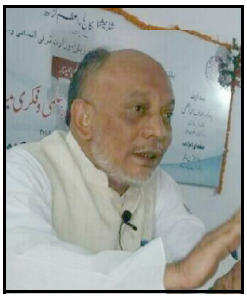
نام رسالہ: ماہنامہ طبی ڈائجسٹ 'الشفاء'

مدیر : سید اعجاز حسین
ضخامت : 74 صفحات
قیمت : 30 روپے
ملنے کا پتہ : 2861 کوچہ چیلان، دریا گنج، نئی دہلی۔2
مبصر : نرگس سلطانہ



زیر تبصرہ رسالہ ماہنامہ طبی ڈائجسٹ 'الشفاء' نومبر 2020 کا شمارہ ہے۔ اردو میں طب سے متعلق رسالہ شائع کرنا بڑی بات ہے۔ قرآن کے حساب سے ''اللہ تعالیٰ نے کوئی ایسی بیماری نہیں نازل کی جس کی شفاء نہ اتاری ہو''۔

اداریہ مدیر صاحب نے حفظان صحت کو مدنظر رکھتے ہوئے ہی تحریر کیا ہے۔ آج بہت سی قسم کی بیماریوں سے انسان جوجھ رہا ہے۔ اس وقت جو خاص بیماری ہے وہ کورونا ہے لیکن شوگر، ہائی بلڈ پریشر، دل کا عارضہ، اور دیگر بڑی بیماریاں زندگی میں معمول بن گئی ہیں۔ یہ رسالہ حفظان صحت کے لیے معلوماتی ہے۔ قرآن کی دعاؤں کے ساتھ ساتھ طبی بھاؤ بہت خوب ہے۔ رسالہ اگر خرید کر پڑھا جائے، تو گھر کے ہر فرد کو چھوٹی بڑی بیماریوں سے آگاہ کیا جاسکتا ہے۔ رسالے میں شائع طبی مضامین درج ذیل ہیں۔ غذائی عادت اور صحت مند زندگی، زیادہ پانی فائدہ مند، جھوٹ بولنے سے دماغ بے حس ہوجاتا ہے، خوش رنگ اور خوش ذائقہ پھل، نشاستہ دار غذائیں اور تھکن، کون سی بیماری کس ماہ میں، انسانی جسم میں حیرت انگیز اسرار، حکیم ابن سینا، اور لہسن کے فوائد وغیرہ۔ اسی طرح رسالے میں ہر مہینے طب سے متعلق معلومات ہم گھر بیٹھے معلوم کر سکتے ہیں اور چھوٹی چھوٹی بیماریوں کا گھر بیٹھے ہی علاج کیا جاسکتا ہے۔☆



ماہر شبلیات
ڈاکٹر الیاس الاعظمی سے ایک ملاقات

دھلی ممبئی، لکھنؤ، حیدرآباد، عظیم آباد، کلکتہ اور دیگر اردو کے معروف مراکز کے علاوہ کچھ مراکز ایسے بھی ہیں جو گوشوں اور مخصوص علاقوں میں واقع ہیں مگر ان کا فیضان عام ہے اور ان مراکز کے روح رواں یا سرپرست، اردو ادب، اردو تہذیب اور ثقافت کی ترویج واشاعت میں مصروف ہیں۔ وہ ہیں تو گوشہ نشیں، مگر ان کا تذکرہ انجمن انجمن ہے۔

مرکز اردو اعظم گڑھ سے وابستہ ماہر شبلیات، ناقد ومحقق **ڈاکٹر الیاس الاعظمی** سے 'آج کل' کے لیے **عمران عاکف** نے گفتگو کی۔

سوال: آپ کی پیدائش کہاں ہوئی اور ابتدائی تعلیم وحالات کے متعلق تفصیل سے فرمائیں۔

جواب: ناچیز ضلع اعظم گڑھ کے ایک چھوٹے سے گاؤں مہراج پور میں پیدا ہوا۔ ابتدائی تعلیم والد مرحوم حاجی عبدالرزاق سے حاصل کی۔ اس کے بعد مکتب کی تعلیم گاؤں میں حاصل کی۔ بعد ازاں اعلا تعلیم کے لیے جامعۃ الرشاد، اعظم گڑھ میں داخل ہوا۔ والد صاحب مرحوم کی خواہش تھی کہ سند یافتہ عالم بنوں، مگر گھر کے مالی حالات اس قدر خراب تھے کہ تعلیم درمیان میں ہی چھوڑنی پڑی۔ چنانچہ میں چند سال بعد واپس گاؤں آ گیا۔ میری گاؤں واپسی میرے والد مرحوم کے لیے بہت تکلیف دہ تھی، انھیں بہت قلق ہوا۔ کیوں کہ وہ تعلیم کی اہمیت سے واقف تھے اور ان کے علاوہ اس پورے گاؤں میں کوئی بھی شخص تعلیم یافتہ نہیں تھا۔ مگر وہ حالات سے آگاہ تھے اس لیے میرے عذر کو سمجھ گئے۔ اب گھر کی گرہستی اور دیگر حالات کو سمجھ کر انھوں نے اس دلی درد کو برداشت کر لیا۔

سوال: آپ کو مطالعے، کتب خوانی، تحریر، تحقیق اور تنقید نگاری کا شوق کیسے پیدا ہوا اور پروان چڑھا؟

جواب: اللہ اللہ! ایک ہی سانس میں اتنے سوال۔ مگر درست ہی تو ہے۔ اس طرح مجھے اپنی پوری علمی وادبی اور مطالعاتی زندگی کے متعلق مرحلہ وار بتانے میں آسانی ہو جائے گی۔

میرے والد محترم 1932 کے مڈل پاس تھے اور بڑی اچھی استعداد کے مالک تھے۔ گاؤں میں اکیلے وہی پڑھے لکھے تھے اور گاؤں کے مذہبی اداروں، جیسے مسجد، مکتب، قبرستان کے متولی بھی۔ صوم وصلوٰۃ کے پابند اور اس وقت خدا رسیدہ بزرگ اور عارف الٰہی مولوی سعید احمد خاں سے بیعت تھے۔ قرآن پاک، ترجمہ مولانا اشرف علی تھانوی، بہشتی زیور، تفسیر علامہ شبیر احمد عثمانی اور دیگر مذہبی کتب کا مطالعہ، ان سے عقیدت ان کی عادت ثانیہ تھی۔ انھیں مطالعہ کرتے ہوئے دیکھ کر مجھے بھی مطالعے کا شوق پیدا ہوا اور کتابوں سے شغف وانسیت دن بہ دن بڑھتی ہی چلی گئی۔ والد صاحب کی عدم موجودگی میں، میں ان کی الماری میں رکھی کتابیں پڑھا کرتا تھا۔ جب میں نے الماری میں رکھی ان قیمتی کتابوں کا مطالعہ کر لیا تو اب مزید مطالعے کی احتیاج ہونے لگی۔ یہ شوق دن دوگنی تھا۔ اس شوق نے مجھے اعظم گڑھ کے مکتبوں اور بک ڈسٹری بیوٹرس تک پہنچا دیا، جہاں دینیات، ادبیات، اصلاحیات، کے علاوہ سیاسیات، سماجیات اور دیگر موضوعات پر مشتمل کتب سے اپنی تشنگی کا سامان کرتا تھا۔ اس طرح میرے گھر پر ایک چھوٹا سا کتب خانہ قائم ہو گیا، جس کا قاری بھی میں ہی اور منتظم بھی۔ میرے اس شوق کو گاؤں والے بے کاری کا مشغلہ کہتے تھے، مگر میں نے کسی کی پروا نہیں کی۔ میرا یہ شوق اب اتنا بڑھا کہ ایک دوست نے مجھے دارالمصنّفین تک پہنچا دیا۔ یہاں میں کتابت سیکھنے لگا۔ یہاں کے قدیم وجدید وکتابوں کا قیمتی خزانہ دیکھ کر میں حیران وششدر رہ گیا۔ ہزاروں کتابوں اور سینکڑوں رسائل کی موجودگی نے مجھے ایک تحیر خیز دنیا سے آشنا کیا۔ کشاں کشاں میرے دل میں کتابوں، مصنّفین ادب اور ادبیات کی اہمیت پیدا ہوتی چلی گئی، وہ دیوانگی تو نہیں تھی، ہاں! شیفتگی ضرور تھی۔ میں ان کتابوں کے تئیں ہر دن دل میں ایک ''خاص مقام'' بناتا چلا گیا۔

یہاں سے میری نئی زندگی کا آغاز ہوا جو آج کی زندگی سے عبارت ہے۔ اس کی نیو اسی وقت پڑ چکی تھی، جس پر ایستادہ پرشکوہ عمارت موجود ہے۔ اسی طرح ادھوری تعلیم کی تکمیل کا خیال بھی ایک بار پھر پیدا ہوا اور میں نے پہلے پرائیویٹ امتحانات دیے پھر شبلی نیشنل کالج سے ادھوری تعلیم مکمل کرنا شروع کر دیا۔

اس طرح کہ پھر سے میری زندگی معمول پر آ گئی اور شوق کتب خواندگی تھا کہ روز افزوں۔ میں روزانہ بلا ناغہ کتب خانہ دارالمصنّفین پہنچنے لگا۔ یہاں موجود کتب ورسائل کی ورق گردانی نے میری دنیا ہی بدل ڈالی۔ میں اس کتب خانے کے چھوٹے سے گوشے میں بیٹھ کر، میں موجود اُن آئینہ ہائے جہاں نما میں پوری دنیائے موجود (فزیکل ورلڈ) کو دیکھنے لگا۔ اس مشغلۂ کتب بینی ومطالعہ نے مجھے شعور، وجدان، عرفان، آگہی، واقفیت، نظر، احساس، تفکر، تہذیب، ادب، سماج، سیاست، نظریہ، انسانیت شناسی الغرض وہ سب سکھا دیا، جن کی امین وہ کتابیں تھیں۔ متعدد علوم بھی انھوں نے سکھائے۔ تاریخ، روایت اور سلسلوں سے بھی ان ہی کتابوں نے آگاہ کیا تھا۔ جب میرا مطالعہ ایک مقام تک پہنچ گیا تو اب اس خزینے کو قرطاس وکاغذ پر رقم کرنے کا وقت آ گیا۔ اس طرح میں چاندی جیسے کاغذ پر، حرفوں کا سونا پگھلانے لگا۔

دارالمصنّفین میں کتب، رسائل، دستاویزات بہت ترتیب سے موجود تھیں۔

رسائل کی مبسوط ومکمل، فائلیں، اخبارات کے پلندے، حروف تہجی، موضوعات اور متعلقات کے مطابق ریکس میں لگی کتابوں کی اس خوش سلیقگی نے بھی میرے لیے بہت راحتیں مہیا کیں۔

میرا ایم اے مکمل ہو رہا تھا مگر میرے مطالعے کا شوق اسی طرح تازہ اور توانا تھا جیسے پہلے دن تھا۔ گو ترجیحات بدل چکی تھیں اور اب ہندو پاک کے اہم رسائل، ادب عالیہ کے ترجمان، رجحان ساز اور فکر انگیز مجلّات وکتب ہی زیر مطالعہ رہتی تھیں۔ اب میں ان میں شامل مضامین وتخلیقات پر اپنی رائے بھی دینے لگا اور ان آرا کو مراسلوں کی صورت میں ارسال کرنے لگا، وہ مراسلے ان مؤقر رسائل کی زینت بننے لگے، اس طرح مجھے حوصلے ملتے گئے اور میں قلم کو مضبوطی واستحکام سے تھامنے لگا۔ اسی وقت مجھے اس چھوٹے سے آلے میں اپنی زندگی کا مقصد، فرض منصبی، مستقبل اور وہ عبادت نظر آنے لگی جو نوائے قرطاس وقلم سے عبارت ہے۔

سوال: اچھا سر کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ اس وقت آپ کے زیر مطالعے بطور خاص کون کون سے رسائل رہتے تھے، یا ان میں سے بھی آپ کو کون سا رسالہ سب سے زیادہ پسند تھا۔

جواب: (ہنس کر) جہاں تک سوال کے دوسرے جز کا تعلق ہے تو، اس کا جواب بہت مشکل ہے۔ کیوں کہ ہر رسالے کی اپنی اپنی اہمیت اور مقام ہوتا ہے۔ نیز کسی رسالے کی پسندیدگی کا معیار اس کے مشمولات اور مضامین کا انتخاب ہوتا ہے۔ چنانچہ میرے زیر مطالعہ رسائل اور ان کا انتخاب جو میں نے کیا تھا، وہ سب اس ضمن میں ایک سے بڑھ کر ایک تھے۔ تاہم بکثرت جن رسائل کو میں نے زیادہ دیر تک اور تا حال پسند کیا ہے، ان میں سے چند ایک یہ ہیں:

ترجمان الاسلام، بنارس۔ ماہنامہ الرشاد، اعظم گڑھ۔ معارف، اعظم گڑھ۔ آج کل، دہلی۔ فکر ونظر، اسلام آباد۔ فکر ونظر، علی گڑھ۔ تہذیب الاخلاق، علی گڑھ۔ نواب ادب، ممبئی۔ برہان، دہلی۔ وغیرہ۔ ان رسائل سے نہ صرف میں زندگی بھر متاثر رہا ہوں، بلکہ انھوں نے میرے مراسلات، تخلیقات، مضامین ومقالات کو بھی خصوصی اہتمام سے شائع کیا ہے۔ نیز ان کے مشمولات نے علمی وادبی دنیا میں مجھے مہمیز بھی کیا ہے۔

سوال: سر وہ کون کون سی کتابیں ہیں جنھوں نے آپ کی شخصیت کی تعمیر کی، علم وادب کا شغف بکثرت پیدا کیا اور آپ سمجھتے ہیں کہ انھوں نے آپ کی کایا پلٹ دی؟

جواب: قرآن مجید، دیگر کتب الٰہی وحدیثیات کے علاوہ جن کتابوں میں میری شخصیت سازی میں اہم کردار ادا کیا اور جنھوں نے میری کایا پلٹی، ان میں علامہ شبلی نعمانی کی کتب کا میں بطور خاص ذکر کروں گا۔ میں آج بھی دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ الفاروق، سیرۃ النبیؐ المامون، سیرۃ النعمان، شعر العجم جیسی کتابیں اب تک اردو میں لکھی ہی نہیں گئیں۔ یہ کتابیں نہ صرف علمی اور فکری تشنگی کا سامان کرتی ہیں بلکہ زبان وادب اور اسلوب کی دل کشی اور لہجے کی رعنائی سے بھی ہم کنار کرتی ہیں۔ یادش بخیر، میں اس موقع پر دار المصنّفین کے سابق ناظم مولانا شاہ معین الدین ندوی کا ذکر کروں گا جو علامہ شبلی اور سید سلیمان ندوی کی تصانیف کے مطالعے کو ہر اس شخص کے لیے ضروری قرار دیتے تھے، جو قلم پکڑنا اور تصنیف وتالیف کا مشغلہ اختیار کرنا چاہتا تھا۔ اسی طرح مولانا سعید احمد اکبر آبادی بھی علی گڑھ کے ریسرچ اسکالرس کو یہی مشورہ دیتے تھے کہ وہ 'المامون'، 'الفاروق'، 'شعر العجم'، 'حیات شبلی' اور 'خیام' وغیرہ کا مطالعہ اہتمام سے کریں۔ یہ کتابیں نہ صرف مطالعہ وتحقیق کا جذبہ پیدا کرتی ہیں بلکہ لکھنے پڑھنے کا سلیقہ بھی عطا کرتی ہیں۔

سوال: سر کیا آپ اپنے اس دور کے کسی محسن ادیب اردو دوست کا ذکر کرنا چاہیں گے، جنھوں نے آپ کی رہنمائی کی ہو؟

جواب: ضرور ضرور! بزرگوں میں مولانا ضیاء الدین اصلاحی مدیر معارف اور احباب میں بہ طور خاص مولانا عمیر الصدیق ندوی [رفیق دار المصنّفین، اعظم گڑھ] نے میری بڑی رہ نمائی اور رہبری کی۔ تصنیف وتالیف کے گر بتائے، بلکہ باقاعدہ اصلاح کر کے معارف میں مضامین ومقالات شائع کیے۔

سوال: سر آپ کا تحقیقی موضوع یا مقالہ کس عنوان سے تھا اور آپ نے کس یونیورسٹی میں یہ مقالہ جمع کر کے ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی۔

جواب: میرے تحقیقی مقالے کا عنوان: 'دار المصنّفین کی تاریخی خدمات' تھا۔ اس کے لیے دار المصنّفین کا کتب خانہ میرا معاون اور ہم دم بنا اور اس مقالے پر مجھے پوروانچل یونیورسٹی، جون پور نے پی ایچ ڈی کی سند تفویض کی اور اسے خدا بخش اورینٹل لائبریری، پٹنہ نے شائع کیا۔

سوال: اس موقع پر کیا اپنے کسی یادگار اور قابل فخر کارنامے کا ذکر مناسب سمجھیں گے؟

جواب: بالکل! وہ کارنامہ ایسا ہے جس کی من جانب اللہ توفیق ونصرت اور اس کی تکمیل پر مجھے ہمیشہ ناز رہے گا۔

قصہ یہ ہے کہ میں نے جس زمانے میں تصنیف وتالیف کی جانب توجہ کی اس وقت میرے احباب اور بزرگ تذکروں کی تصنیف وتالیف میں مصروف تھے۔ مثلاً مولانا ضیاء الدین اصلاحی مرحوم 'تذکرۃ المحدثین' لکھ رہے تھے۔ مولانا عمیر الصدیق ندوی 'تذکرۃ الفقہا' اور عارف عمری 'تذکرۂ مفسرین ہند' ..... دراصل یہ دار المصنّفین کے پروجیکٹ تھے۔ جب میرا نمبر آیا تو میں نے 'تذکرۃ القراء' کا انتخاب کر لیا اور الحمد للہ تمام مصادر کتب کے حوالوں سے اسے قلم بند کر لیا۔ اس کے لیے میں نے عربی زبان ابتدا سے پڑھی اور اس میں مہارت حاصل کی۔ اس طرح یہ قابل فخر کتاب مرتب ہو کر منصۂ شہود پر آئی۔

کارنامہ وجود میں آیا۔ پروفیسر یٰسین مظہر صدیقی نے اسے اردو زبان میں اپنے موضوع کی اولین کاوش قرار دیا۔ یہ اعزاز بہ جائے خود قابل ذکر اور فخر ہے۔

سوال: امروز آپ کی شہرت ماہر شبلیات کے طور پر ہے، آپ اس جانب کیسے اور کب آئے، نیز اس موضوع پر آپ کی اولین کتاب کون سی ہے؟

جواب: علامہ شبلی کا اثر چوں کہ ذہن پر بچپن سے ہی تھا۔ ان کی تصنیفات دل چسپ اور دل نشیں انداز واسلوب میں تھیں۔ ان کا مطالعہ عادت ثانیہ بن گیا۔ اب وہی شوق واثر اظہار کے پیرائے میں ڈھل گیا اور نہ جانے کب وکیسے خود بہ خود میرا موضوعِ تحقیق وتصنیف 'شبلیات' بن گیا۔ میری اس موضوع پر اولین کتاب 'متعلقات شبلی' ہے۔ بعد ازاں اس میں اس قدر منہمک ہوا کہ وقت کے گزر جانے کا احساس تک نہیں ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے میری اس موضوع پر 16 کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔ جن میں 'آثار شبلی'، 'نوادرات شبلی'، 'شبلی اور جہان شبلی'، 'مراسلات شبلی'، 'اقبال اور دبستان شبلی'، 'علامہ شبلی کی تعزیتی تحریریں'، 'نقوش شبلی' وغیرہ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ ایک اشاریہ 'کتابیات شبلی' نے بہتوں کو شبلی پر تحقیق وتصنیف کے لیے آمادہ کیا ہے۔

سوال: علامہ شبلی اور دبستان شبلی کے علاوہ اور کون سے خوش نصیب ادبا وشعرا، ناقدین ومحققین ہیں، جو آپ کی پسندیدہ فہرست میں مقام پاتے ہیں؟

جواب: سچی بات تو یہ ہے کہ اردو ادب کی معمولی خدمت کرنے والا ہر ادیب وشاعر، ناقد ومحقق اہم ہے مگر اسے کیا کیا جائے کہ ہمارا ذہن اس میں سے چند ہی کو منتخب کر لیتا ہے اور پوری عمر اُن سے متاثر ہوتا رہتا ہے۔ اسے فطری عمل بھی کہا جا سکتا ہے اور

وقتی بھی۔ جہاں تک بات ہے میرے پسندیدہ ادبا وشعرا اور ناقدین ومحققین کی تو دبستان شبلی سے باہر مولانا حالی، محمد حسین آزاد، مولانا سعید انصاری، مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی، مولانا ابوالکلام آزاد، رشید احمد صدیقی، رشید حسن خاں، شمس الرحمان فاروقی، نسیم حجازی، مشتاق احمد یوسفی، مشفق خواجہ وغیرہ مجھے بے حد پسند ہیں اور ان کی تخلیقات وکارناموں نے مجھے اکثر متاثر ومتحیر کیا ہے۔ ان کے علاوہ بھی متعدد ادبا وشعرا ہیں جن کی کوئی ادا اچھی لگی تو ان پر مضامین لکھے۔ ان کی بھی ایک بڑی تعداد ہے۔ اس طرح مضامین کے تین مجموعے 'عظمت کے نشاں'، 'مطالعات ومشاہدات' اور 'عکس واثر' شائع ہوکر مقبول ہو چکے ہیں۔ حال ہی میں ایک اور مجموعہ 'قد اور سائے' بھی شائع ہوا ہے۔

سوال: ہماری اردو دنیا میں عموماً بت گری کا چلن ہے۔ ہم براہیم کا خوف واحساس کیے بغیر آذر بن جاتے ہیں اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان بتوں کی عقیدت بڑھتی ہی جاتی ہے، ایسا کیوں ہے؟

جواب: دراصل انسان فطری طور پر شخصیت پسند واقع ہوا ہے اور وہ ذہن میں ایک ہیولیٰ قائم کر لیتا ہے۔ ہمارا ادبی ذخیرہ بھی اسی طرح کے ادب سے پُر ہے۔ اس لیے ایک خاص ذہن کی تعمیر ہو جاتی ہے۔ باوجود اس کے شخصیت پرستی کا تو میں بالکل بھی قائل نہیں ہوں۔ کچھ لوگ مثال دیتے ہیں کہ ماں باپ یا دیگر رشتے داروں سے بھی تو انسان کو الف اور انسیت ہو جاتی ہے، مگر وہ اس وقت یہ بھول جاتے ہیں کہ یہ خون کے رشتے ہوتے ہیں اور ان میں فطری یگانگت ہوتی ہے۔

ہمارے اردو ادب میں براہیم کی موجودگی کے باوجود، بت گری کا یہ سلسلہ قدیم سے ہی رہا ہے۔ چنانچہ اس کے باعث ہمارے ادب کا اچھا خاصا نقصان بھی ہوا ہے۔ مگر ان صنم گروں اور اصنام کو اس کی مطلقاً پروا نہیں ہے۔ تاہم خوش آئند بات یہ ہے کہ قدرت ہر اہم موڑ پر براہیم پیدا کر دیتی ہے جو نہ صرف آذروں کو ہدایت کی تبلیغ کرتا ہے مزید بت شکنی کا فریضہ بھی انجام دیتا ہے۔ اس طرح سے ہمارے ادب میں تجدید ہو جاتی ہے۔

جہاں تک سوال کے آخری جز کا تعلق ہے کہ یہ عقیدت کیوں بڑھتی جاتی ہے، اس موقع پر میں بس یہی کہوں گا یہ جہالت ہی ہے جو نہ صرف جذبۂ احترام کو مرعوبیت میں تبدیل کر دیتی ہے بلکہ اس عقیدت کو غلو اور گمراہی وکج روی تک پہنچا دیتی ہے۔

سوال: اردو جامعات میں ہونے والی ریسرچ اور تحقیقات سے آپ کس قدر مطمئن اور متفق ہیں؟

جواب: ہماری جامعات نے اردو زبان وادب کی بڑی خدمات انجام دی ہیں۔ کلی طور پر اتفاق یا عدم اطمینان کا اظہار مناسب نہیں۔ بہت اہم اور اعلا پایہ کے مقالات بھی ہماری جامعات نے لکھوائے ہیں۔ لیکن اسی کے ساتھ بعض ایسے مقالات پر بھی بڑی بڑی اسناد دے دی گئی ہیں جو قابل اشاعت بھی نہیں تھے۔ تحقیق اور ریسرچ کا انھیں نام دینا تو دور کی بات ہے۔ ادھر چند برسوں میں خود اساتذہ جامعات کی تحقیق بلکہ تحقیقات سے مطمئن نہیں رہے ہیں۔ البتہ اب اس کی طرف خاصی توجہ دی جا رہی ہے۔

سوال: ادب کی قدروں سے آپ کیا مراد لیتے ہیں اور انسان بالخصوص ادیب کو ان کی پابندی کس حد تک لازم ہے؟

جواب: آپ نے خاصا طویل اور مشکل سوال کر لیا ہے۔ مشرقی بلکہ مغربی ادبیات میں بھی اقدار کے متعلق مختلف نقطہ ہائے نظر رہے ہیں۔ لیکن میرا خیال یہ ہے کہ جو ادبی تصورات انسانیت کی تکمیل میں بنیادی کردار ادا کریں یا جن سے صالح معاشرہ وجود میں آئے، اصل ادبی اقدار وہی ہیں۔ جمالیاتی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو دل ودماغ اور ذوق ووجدان کو متاثر کرنے والے عناصر ہی سے ہماری قدریں عبارت ہیں۔ انسان عمومی اور ادبا وشعرا خصوصی طور پر ان اقدار کی پاس داری کرتے ہیں اور کرنا بھی ضروری ہے۔ اس معیار سے ہماری شاعری کا اگر چہ ایک بڑا حصہ متاثر اور خزف ریزہ ثابت ہوگا تاہم ایک بہت بڑا ادبی ذخیرہ ادبی قدروں کی پاس داری کا نمونہ ہے۔

سوال: آپ کتاب بینی، مطالعہ، خواندگی کی اہمیت واصول اور کتابوں سے رشتہ استواری کے متعلق نئے عہد کے طلبا، قارئین اردو اور شائقین ادب کے لیے کیا کہنا چاہیں گے؟

جواب: الیکٹرانک میڈیا نے پرنٹ میڈیا کو خاصا متاثر کیا ہے۔ تاہم واقعہ یہی ہے کہ مطالعہ اور کتب بینی سے ذوق ووجدان کو جو غذا فراہم ہوتی ہے وہی اصل اور حاصل ہے۔ اس لیے مطالعہ وکتب بینی کی اہمیت اپنی جگہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے اور اس سے ہمارا رشتہ بہ ہر صورت استوار رہنا چاہیے۔ اس کے بغیر نہ زندگی بہتر ہو سکتی ہے، نہ بہتر معاشرہ وجود میں آسکتا ہے۔ میری خواہش بلکہ نئی نسل کو میرا مشورہ ہے کہ وہ بہ ہر صورت کاغذ وکتاب سے اپنا رشتہ برقرار رکھے۔ خاص طور پر اردو ادب کے حوالے سے سارا قدیم وجدید ادبی ذخیرہ اس لائق ہے کہ اسے حرز جاں بنایا جائے۔ البتہ موجودہ ادبی منظر نامے سے تحقیق وتدوین اور تلاش وجستجو کا فن نظر انداز ہوا ہے، اس کی طرف خاطر خواہ توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

سوال: فی الوقت کون سی کتاب آپ کے زیر مطالعہ یا زیر تصنیف ہے؟

جواب: میرے مطالعے کے دو پہلو ہیں۔ ایک: ادب وانشا کے لحاظ سے بہترین کتب کا انتخاب کر کے ان کا مطالعہ کرنا ہے۔ اس سے علم ومعلومات میں تو اضافہ ہوتا ہی ہے دوسرے اسلوب اور مختلف نظر ہائے ادب سے واقفیت ہوتی ہے۔ میرا اپنا نظریہ ہے کہ اس کا عمل عمر کے ہر مرحلے میں ہونا چاہیے۔

دوسرا پہلو: تصنیفی اور تحقیقی ہے۔ میں جس موضوع پر لکھتا ہوں اس پر کوشش یہ ہوتی ہے کہ قدیم اہل علم نے جو کچھ سپرد قلم کیا ہے اس سے نظری اور عملی دونوں پہلوؤں سے پوری واقفیت ہو جائے اس کے بعد میں قلم اٹھاؤں۔ لازمی طور پر اس طریقۂ عمل تحقیق وجستجو کا پہلو غالب رہتا ہے اور کم تحریریں سامنے آتی ہیں لیکن جو تحریریں یا کتب ومقالات وجود میں آتے ہیں وہ اپنے موضوع کا بہترین سرمایہ ہوتے ہیں۔

میں اس وقت ایک اہم کتاب 'اثرات شبلی' کی تصنیف میں مصروف ہوں اور عہد شبلی سے اب تک ان علوم وفنون، تاریخ وتہذیب اور ادبیات جس میں شبلی نے کام کیا اور ہمارے ادبی ذخیرے میں بیش بہا اضافہ کیا، اس کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ لے رہا ہوں۔ یہ اگر چہ دشوار، دقت طلب اور دماغ سوز کام ہے۔ لیکن اگر پایہ تکمیل کو پہنچ گیا تو امید ہے کہ اردو ادب میں ایک قیمتی اضافہ ہوگا۔

سوال: اردو کے مستقبل کے بارے میں کیا خیال ہے؟

جواب: اردو زبان اگر چہ اس وقت مختلف مسائل اور مشکلات سے دوچار ہے۔ تعصب کی آندھیاں رہ رہ کے اس کے خرمن کو جلا دیتی ہیں۔ لیکن اس کا مستقبل روشن ہے۔ ہماری گنگا جمنی تہذیب کی یہ واحد نمائندہ زبان ہے اس لیے یہ اپنی اثر آفرینی کے سبب آئندہ صدی میں بھی دلوں پر حکمرانی کرے گی۔ آمین!

ڈاکٹر محمد الیاس اعظمی
آنریری فیلو، دارالمصنفین شبلی اکادمی، اعظم گڑھ۔ 276001
فون: 9838573645

پبلی کیشنز ڈویژن کی اردو مطبوعات

آسان پنچ تنتر حصہ 1	وشنو پربھاکر/افتخار احمد خان	160/=
آسان پنچ تنتر حصہ 2	وشنو پربھاکر/سید ضیاء الرحمٰن غوثی	175/=
رانی لکشمی بائی	ششی شرما/سید ضیاء الرحمٰن غوثی	55/=
ہوگی جیت ہماری	سنجیو جیسوال 'سنجے'/افتخار احمد خاں	175/=
دادا بھائی نوروجی	آر پی مسانی/فرحت عثمانی	245/=
راجندر پرساد	کالی کنکر دتہ	325/=
مجاز: شخص اور شاعر	پروفیسر ارتضیٰ کریم	135/=
شہیدوں کے خطوط		155/=
علی سردار جعفری حیات اور تخلیقی جہات	پروفیسر علی احمد فاطمی	155/=
جہانِ رومی	مرزا عبدالباقی بیگ	100/=
خزینۂ غالب	مرتب: ڈاکٹر ابرار رحمانی	130/=
سفینۂ غالب	ادارہ	95/=
آئینۂ غالب (طبع دوم)	ادارہ	75/=
گنجینۂ غالب (طبع دوم)	ادارہ	60/=
گرونانک سے گرو گرنتھ صاحب تک	ڈاکٹر مہیپ سنگھ/سید ضیاء الرحمٰن غوثی	250/=
مدن موہن مالویہ	سیتارام چترویدی/فرحت عثمانی	100/=
گاندھی کی معنویت	خواجہ غلام السیدین/نجم السحر ثاقب	55/=
آجکل اور پریم چند	مرتب: ڈاکٹر ابرار رحمانی	210/=
1857: جنگ آزادی کا درخشاں باب	مرتب: ڈاکٹر ابرار رحمانی	135/=
اٹھارہ سو ستاون کی جنگ آزادی	سریندر ناتھ سین	120/=
قلم، قلم کار اور کتاب	عبدالغنی شیخ	110/=
آجکل اور غبارِ کارواں	ادارہ	170/=
آجکل کی کہانیاں	ادارہ	162/=
آجکل اور سفرنامہ	ادارہ	105/=
آجکل اور صحافت	ادارہ	115/=
آجکل کے ڈرامے	ادارہ	125/=
آجکل کے مضامین	ادارہ	112/=
آجکل اور اقبال	ادارہ	95/=
آجکل اور طنز و مزاح	ادارہ	112/=
اردو ادب کے پچاس سال	ادارہ	95/=
افسانہ آجکل	مرتب: عابد کرہانی	90/=
اٹھارہ سو ستاون	سریندر ناتھ سین/خورشیدہ پروین	556/=
ہندوستانی عوام کی مختصر تاریخ	ایچ آر گھوشال	140/=
بھارتیندو ہریش چندر	(ادارہ)	130/=
ہمارا قومی پرچم	لیفٹیننٹ کمانڈر کے وی سنگھ	110/=
کلاسیکی موسیقار	مترجم: خورشید اکرم	137/=
عوام الناس کے لیے گائڈ	مترجم: عادل صدیقی	145/=
مہاتما گاندھی	آچاریہ کرپلانی/لکشمی چندر یاس	300/=
مہاتما بدھ کی حکایتیں	پال کاروس/مسعود فاروقی	155/=
شہیدوں کے خطوط	ادارہ	110/=
قلی قطب شاہ	نریندر لوتھر/زبیر رضوی	280/=
یادیں مجاہدین آزادی کی	نوین جوشی/راحت جبیں	180/=
غالب بہ صدانداز	تشکیل: برجندر سیال	1000/=
پہیلیاں-امیر خسرو	مرتب: شہباز حسین، نند کشور وکرم	22/=
کاغذی ہے پیرہن	عصمت چغتائی	65/=
کشمیر کی لوک کتھائیں	جے۔این۔گنہر	45/=
ہندوستانی تہذیب کا مسلمانوں پر اثر	ڈاکٹر محمد عمر	127/=
راگ راگنیوں کی تصویریں	شکیل الرحمٰن	325/=
ہند اسلامی طرز تعمیر	ضیاء الدین ڈیسائی/اختر الواسع	54/=
ہندوستان میں اسلامی علوم کے مراکز	ضیاء الدین ڈیسائی/بہار برنی	54/=
ہماری تہذیبی وراثت	راجندر پرشاد، بی این پانڈے	50/=
ہندوستان کے عظیم موسیقار	شمبھو ناتھ مشرا/رئیس مرزا	65/=
سروجنی نائیڈو	تاراعلی بیگ/لکشمی چندر یاس	125/=
حکیم اجمل خاں	ظفر احمد نظامی	75/=
سردار ولبھ بھائی پٹیل	آئی جے پٹیل/یعقوب یاور	95/=
مختار احمد انصاری	مشیر الحسن/فرحت احساس	80/=
رفیع احمد قدوائی	ڈاکٹر ہاشم قدوائی	60/=
سرسید احمد خاں	خلیق احمد نظامی/اصغر عباس	35/=
حسرت موہانی	ڈاکٹر خلیق انجم	50/=
مولانا آزاد (طبع دوم)	عرش ملسیانی	40/=
بدرالدین طیب جی	اے جی نورانی/راجندر انجم	70/=
مظہر الحق	قیام الدین احمد، جٹا شنکر جھا	55/=
ڈاکٹر ذاکر حسین	ماجدہ اسد	120/=
رابندر ناتھ ٹیگور	ہرن مے بنرجی/اشہر ہاشمی	80/=
جواہر لال نہرو	ایم چلاپتی راؤ/کے بی شرما	105/=
روشنی کے مینار	مرتب: شہباز حسین	25/=
ہم ایک ہیں (دوسری بار)	عرش ملسیانی	90/=

نوٹ : کتابیں اور رسالے منگوانے کے لئے رقم بشکل ڈرافٹ بنام ڈی جی پبلی کیشنز ڈویژن پیشگی ارسال کریں۔

کتابیں کسی بھی صورت میں وی پی سے نہیں بھیجی جائیں گی۔

ملنے کا پتہ : بزنس منیجر، پبلی کیشنز ڈویژن، سوچنا بھون، نئی دہلی۔3

بقیہ: اردو تحقیق پر ایک نظر

تحقیق کی اس مقبولیت کے باعث پچھلے دہے (1961 تا 1970) میں بڑی معرکے کی دریافتیں ہوئی ہیں۔اس دہے میں اٹھارویں صدی کے تین نثری شاہکاروں کا متن دریافت اور شائع ہوا یعنی:

ہندوستان میں فضلی کی 'کربل کتھا' اور عیسوی خاں کی قصہ 'مہر ودلبر' اور پاکستان میں شاہ عالم ثانی کی داستان 'عجائب القصص'۔''

پچھلے پانچ سال کی کمائی کچھ اور بھی وقیع ہے۔اس دوران میں دو تاریخ ساز تحقیقی انکشافات ہوئے۔ ڈاکٹر حفیظ قتیل نے اپنی کتاب 'معراج العاشقین کا مصنف' میں ثابت کیا کہ 'معراج العاشقین' خواجہ بندہ نواز کی تصنیف نہیں بلکہ بہت بعد کے ایک بزرگ کا کارنامہ ہے۔

دیوی سنگھ چوہان سابق ممبر مہاراشٹر پبلک سروس کمیشن نے دریافت کیا کہ قصۂ حسن ودل (فارسی مثنوی دستورِ عشاق اور اردو سب رس) کا آخری ماخذ کرشن مشر کا سنسکرت ڈراما 'پربودھ چندرودیئے' ہے۔ان کی اس تحقیق سے اہل اردو کو ڈاکٹر نورالسعید اختر نے روشناس کرایا۔قصہ حسن ودل پربودھ چندرودیے کا لفظی ترجمہ نہیں لیکن اس پر مبنی ہے۔

1969 میں غالبؔ صدی نے غالبیات کے ساتھ ساتھ ادبی تحقیق کا مذاق عام کردیا۔ بھوپال میں غالبؔ کے خود نوشت اولین دیوان اور لاہور میں 'گلِ رعنا' کے خود نوشت مخطوطے کی دریافت گل سرسبد ہے۔ان کتابوں کی اشاعت اور دیوان کے مخطوطے پر ڈاکٹر انصار اللہ نظر کے اعتراضات نے ادبی تحقیق کو خواص کی انجمن سے نکال کر عوام کے مجمع تک پہنچادیا۔مخطوطے کا کاتب غالبؔ ہے کہ کوئی اور، اور سن کتابت کیا ہے۔ان امور کی لامتناہی بحث نے تحقیق کو بہت فائدہ پہنچایا۔کاتب اور سنہ کے علاوہ جعل اور الحاق کے حملہ امکانات کا بڑی دقت نظر سے جائزہ لیا گیا جس سے عام قاری کو تحقیق متن کے رموز سے دلبستگی ہوگئی۔ہمیں نو دریافت نسخے کے دونوں ایڈیشنوں کے مرتبوں، معترضوں اور وکیلوں کا ممنون ہونا چاہئے۔

اردو کے موجودہ محققوں کو تین گروہوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلے میں ہمارے وہ بزرگ محقق ہیں جو تحقیق کی آبرو ہیں۔سید مسعود رضوی، مولانا عرشی، قاضی عبدالودود اور مالک رام صاحب، ہم سب کے لیے مشعل راہ ہیں۔ان کی کبرسنی اور صحت کے پیش نظر ہم اب ان سے نئے وسیع کاموں کی توقع نہیں کرسکتے۔خوشی کی بات ہے کہ محققوں کی دوسری اور تیسری نسل میں کئی ایسے اہل نظر افراد ہیں جن کے کاموں پر بھروسہ کیا جاسکتا ہے۔

دوسری نسل میں ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی، ڈاکٹر نذیر احمد، ڈاکٹر مختار الدین احمد اور ڈاکٹر مسعود حسین خاں وغیرہ ہیں۔

اور تیسری نسل میں وہ اہل نظر تحقیق کار آتے ہیں جو پچھلے دس بارہ سال سے لکھ رہے ہیں۔ان دونوں نسلوں پر تحقیق کی پاسبانی کی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہے۔اور ان کے بعد تحقیق کنندوں کی وہ نو خیز نسل آتی ہے جو یونیورسٹیوں اور کالجوں میں ریسرچ اسکالر یا مبتدی لکچرر کے طور پر کام کررہی ہے۔ان کی تعداد پیش رو گروہوں سے زیادہ ہے۔اب ہمیں تعداد سے زیادہ معیار پر توجہ کرنی ہے۔تحقیق کا سب سے بڑا مسئلہ یہی ہے کہ پھیلاؤ کے باوجود گہرائی کس طرح برقرار رکھی جائے۔ ذیل کے ماخذ سے معیارِ تحقیق کی ترقی میں مدد مل سکتی ہے:

(1) درسگاہوں میں نئے ریسرچ اسکالروں کو نگراں کی ہدایت اور طریق تحقیق کے نصاب۔

(2) اصول تحقیق پر کتابیں اور مضامین۔

(3) کہنہ مشق محققین کے تحقیقی کاموں کا مطالعہ۔

(4) بزرگ محققین کی نئی تحقیق کے تسامحات کی نشان دہی۔

چونکہ تحقیقی کاموں کی سب سے زیادہ تعداد پی ایچ ڈی کے ریسرچ اسکالروں کی دین ہوتی ہے۔اس لیے نگراں کی صحیح ہدایت کی بہت زیادہ اہمیت ہے۔اس کے لیے ضروری ہے کہ نگراں خود صراط مستقیم سے واقف ہو اور اس کے پاس اتنا وقت ہو کہ وہ اپنے شاگردوں کی رہبری کرسکے۔نگراں کی مناسب ہدایت نہ ملنے سے شاگرد کو جو خسارہ ہوتا ہے اس کی مثال میں اپنا تجربہ پیش کرتا ہوں:

1945 میں جب میں نے ریسرچ شروع کی، مجھے یہ نہیں بتایا گیا کہ فٹ نوٹ میں حوالے اور اسناد درج کرنے چاہئیں۔نتیجہ یہ ہوا کہ پورا مقالہ حوالوں سے معریٰ تھا۔ صرف آخر میں کتابیات کی فہرست تھی۔ڈگری ملنے کے بعد میں چندے بے روزگار رہا۔ ملازم ہونے پر 1950 میں میں نے یہ مقالہ جیوں کا تیوں انجمن ترقی اردو پاکستان کو اشاعت کے لیے بھیج دیا۔اس طرح ''اردو کی نثری داستانیں'' کی طبع اول میں کوئی صفحہ حوالوں سے داغدار نہیں۔اگر میرے نگراں نے مجھ پر یہ رمز افشا کیا ہوتا تو ایسی خامی کیوں راہ پاتی۔دوسرے ایڈیشن میں یہ سقم دور کردیا گیا ہے۔

طریق تحقیق کا کورس عثمانیہ اور دلّی یونیورسٹیوں میں رائج ہے۔ دلّی میں یہ ایم لٹ حصہ اول کی شکل میں ہے۔ میں نے دونوں درسگاہوں کا نصاب دیکھا ہے جو بہت خوب ہے۔عملاً اس کے اطلاق کا کیا تجربہ رہا، مجھے معلوم نہیں۔

مناسب نگرانی نہ ملنے کی کسی قدر تلافی اصول تحقیق کی کتابوں سے ہوسکتی ہے۔ انگریزی میں اس موضوع پر متعدد کتابیں ہیں.....لیکن افسوس ہے کہ یہ کتابیں بازار میں بہ آسانی دستیاب نہیں۔ اردو میں اس موضوع پر لکھنے کی تحریک بہت کچھ انجمن اساتذۂ اردو کے شعبۂ تحقیق سے ہوئی۔حیرت ہے کہ اردو میں تحقیق کی اتنی بھرپور روایت کے باوجود ابھی تک اصولِ تحقیق پر صرف دو کتابیں ملتی ہیں:

(1) ڈاکٹر خلیق انجم: ''متنی تنقید۔'' (2) عبدالرزاق قریشی: ''مبادیات تحقیق''۔

دونوں کتابیں ایسی ہیں کہ ہر تحقیق کرنے اور کرانے والے کو انہیں پڑھنا چاہئے۔ان کے علاوہ مضامین خاصی تعداد میں ملتے ہیں۔ان میں سے بیشتر اس انجمن کے اس شعبے کی بدولت وجود میں آئے۔پہلی کانفرنس منعقدہ دہلی کے مقالات کا مجموعہ شائع ہوچکا ہے۔اس میں شامل نظریاتی تحقیق پر دو مضامین کا ذکر کروں گا۔

(1) ڈاکٹر تنویر احمد علوی: قدیم دواوین کی ترتیب کے مسائل۔

(2) ڈاکٹر خلیق انجم: ''اردو تحقیق اور حقائق''۔

دوسری اور تیسری کانفرنس کے مجموعے ابھی شائع نہیں ہوئے۔ان میں بھی بعض بہت اچھے مضامین پڑھے گئے تھے۔لیکن میں محض حافظے پر تکیہ کرکے ان کے بارے میں

کچھ کہنے کے قابل نہیں۔

اگر ان سب کانفرنسوں کے شعبۂ تحقیق میں پڑھے گئے مقالوں کا ایک مجموعۂ انتخاب شائع کر دیا جائے تو یہ اصول تحقیق پر اچھی پر مغز کتاب ہوگی۔ اسی موضوع کا ایک اور اہم کارنامہ رسالہ 'آجکل' کا اردو تحقیق نمبر بابت اگست 1967 ہے۔ اس کے تین مضامین نظریاتی ہیں:

(1) قاضی عبدالودود: اصول تحقیق

(2) مالک رام: مخطوطات۔ تلاش قرأت اور ترتیب۔

(3) ڈاکٹر محمد حسن: ادبی تحقیق کے بعض مسائل۔

ان پر چند جستہ جستہ مضامین کا اضافہ کر لیجئے۔

(4) ڈاکٹر سید عبداللہ: تحقیق و تنقید 'نیا دور' 5,6 کراچی 1956۔

(5) ڈاکٹر سید عبداللہ: تحقیق و تنقید کے مقامات اتصال، اردو نامہ کراچی، اپریل تا جون 1960۔

(6) قاضی عبدالودود: صحت متن 'تحریک' دہلی، ستمبر 1962۔

(7) ڈاکٹر نذیر احمد: تحقیق و تصحیح متن کے مسائل 'نقوش' مارچ 1963۔

(8) گیان چند: تحقیق کے تقاضے 'شیرازہ' سری نگر، جنوری 1964۔

(9) ڈاکٹر نذیر احمد: تاریخی تحقیق کے بنیادی مسائل 'جوار بھاٹا' دہلی اپریل 1965۔

(10) ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں: فن تحقیق 'نقوش' جنوری 1966۔

(11) ڈاکٹر سید محمد عقیل: تحقیق و مواد کی فراہمی کا مسئلہ۔ 'نقوش' مئی 1967۔

یقین ہے کہ اور بہت سے مفید مضامین شائع ہوئے ہوں گے لیکن میری کم نظری کی ان تک رسائی نہیں ہو سکی۔

معیارِ تحقیق کو بلند کرنے کا تیسرا وسیلہ کہنہ مشق محققین کے تحقیقی کاموں کا مطالعہ ہے۔ اگلے زمانے میں مبتدی شاعر جب استاد کے پاس زانوئے تلمذ تہہ کرنے جاتا تھا تو اسے مشورہ دیا جاتا تھا کہ قدیم شعرا کے زیادہ سے زیادہ دواوین شروع سے آخر تک پڑھ جائے۔ تحقیقی نظر پیدا کرنے اور تیز کرنے کے لیے ضروری ہے کہ بزرگ محققین کے کاموں کا بالاستیعاب مطالعہ کیا جائے تاکہ ان کے لائحہ کار کا اندازہ ہو اور ان کی تقلید کی کوشش کی جائے۔

یہ ضرور ہے کہ تقلید میں محض جزوی کامیابی ہی ہو سکتی ہے کیونکہ نئے مصنفین کے پاس بزرگ محققین کا تبحر علمی ہے نہ تجربہ۔ نہ ان جیسے وسائل ہی فراہم ہیں، پھر بھی آدرش کو بلند رکھنے میں کوئی نقصان نہیں، فائدہ ہی ہے۔

معیار کی بہتری کا چوتھا سرچشمہ غلطیوں کی نشاندہی ہے۔ اگر زیادہ تجربہ کار محقق کم تجربہ کار محققوں کے کاموں کی خامیوں کی طرف اشارہ کریں تو اس میں آخر الذکر کا نفع ہے نقصان نہیں۔

قاضی عبدالودود اور رشید حسن خاں کی گوش مالیوں نے کتنے جلد بازوں کو پھونک پھونک کر قدم رکھنا سکھایا ہے۔ یہ ضروری ہے کہ اغلاط کی نشاندہی میں احساسِ برتری یا طنز و تمسخر کا شائبہ نہ ہو۔ غلطی کون نہیں کرتا۔ اغلاط کی طرف ہمدردی و دلسوزی کے ساتھ اشارہ کیا جائے تو اس سے اصلاح ہوگی۔ چبھتے ہوئے الفاظ میں وہی بات کہی گئی تو مشارٌ الیہ چڑھ کر اپنی بات پر اڑ جائے گا اور اپنا موقف بدلنے سے انکار کر دے گا۔ گویا انشائیہ کا حق تو ادا ہو جائے گا لیکن اعتراض کا مدعا خبط ہو جائے گا۔ یہ نہایت ضروری ہے کہ تحقیقی بحث میں ذاتی حملے نہ کیے جائیں۔ دشتِ تحقیق کو انشا و مصحفی کے معرکوں کا میدان نہ بنائیے۔ فریق ثانی کا بھی فرض ہے کہ علمی انداز کے اعتراضوں پر برا نہ مانے اور انہیں ذاتی تعلقات پر اثر انداز نہ ہونے دے۔

اور اس سلسلے میں دو رجحانات کی طرف اشارہ کیا چاہتا ہوں۔ یونیورسٹیوں کے باہر کی بعض مقتدر ہستیوں کو یہ کہتے سنا گیا ہے کہ یونیورسٹیوں میں اردو ریسرچ کے نام پر جو کچھ ہو رہا ہے وہ محض ننگ تحقیق ہے۔ قابل قدر تحقیق صرف مدرسے کے باہر ہو رہی ہے۔ میں اس سے اتفاق نہیں کر سکتا۔ نئے ریسرچ اسکالروں کے ابتدائی تحقیقی کاموں کو دیکھ کر ایسا عام فیصلہ صادر کر دینا ویسی ہی بات ہے جیسے بعض اہل ہندی اردو غزل کے معمولی اشعار کو دیکھ کر فتویٰ صادر کر دیتے ہیں کہ اردو شاعری میں عاشقی معشوقی اور شراب و کباب کے سوا دھرا ہی کیا ہے۔

اگر درسگاہوں کے باہر چند علما (جن کو ایک ہاتھ کی انگلیوں پر شمار کیا جا سکتا ہے) دادِ تحقیق دے رہے ہیں تو درسگاہوں نے بھی مرحومین میں پروفیسر محمود شیرانی، ڈاکٹر عبدالحق، منشی مہیش پرشاد، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، ڈاکٹر زور اور پروفیسر عبدالقادر سروری کو اور زندوں میں پروفیسر مسعود حسن رضوی، ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی، ڈاکٹر نذیر احمد، ڈاکٹر مسعود حسین خاں، ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو وغیرہ کو پیدا کیا ہے۔ اور جہاں تک میرا سوال ہے میں اس احساس برتری سے محروم ہوں کہ رشید حسن خاں، نثار احمد فاروقی، ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ، ڈاکٹر مسیح الزماں، ڈاکٹر ابومحمد سحر، ڈاکٹر محمود الٰہی، ڈاکٹر حفیظ قتیل، ڈاکٹر تنویر علوی، ڈاکٹر خلیق انجم، ڈاکٹر انصار اللہ نظر اور ان جیسے دوسرے حضرات کی تحقیقات کو نظر انداز کر سکوں۔

میں یہ دعویٰ کرنے کی جرأت کرتا ہوں کہ میری نظر سے نئے محققوں کے ایسے چند غیر مطبوعہ اور کئی مطبوعہ پی ایچ ڈی کے مقالے گزرے ہیں جن کا مصنف ہونے میں مجھے فخر ہوتا۔ اگر ان کے مقابلے میں ساقط المعیار مقالوں کی تعداد زیادہ ہے تو ایسا کس میدان میں نہیں ہوتا؟ کیا شاعری، تنقید، فسانہ، ناول، صحافت وغیرہ میں اکثریت کم رتبہ کاموں کی نہیں؟ پھر تحقیق ہی میں منتخب کاموں سے چشم پوشی کر کے پست کاموں کے انبار کی بنا پر کیوں مخالفانہ فیصلہ کیا جائے۔

دوسرا رجحان یہ ہے کہ جس طرح زندگی کے دوسرے شعبوں میں نوجوانوں نے بزرگوں کی سرداری کو تسلیم کرنے سے بغاوت کر دی ہے اسی طرح تحقیق میں جواں سال محققوں نے بزرگ تر محققوں کی دریافتوں پر آنکھ موند کر آمنّا و صدّقنا کہنے سے انکار کر دیا ہے۔ انہیں پرکھنے کے بعد ہی قبول کرتے ہیں۔ چنانچہ بعض اوقات خود لوگ بزرگوں کے سہو پر انگلی رکھ دیتے ہیں۔ اب کوئی بزرگ کوئی بڑا پروفیسر محض اپنے منصب اور رتبے کی بنا پر اپنی بات نہیں منوا سکتا۔

میں استفہامی باغیانہ ذہنیت کا خیر مقدم کرتا ہوں کہ یہ آزادیٔ نظر و جرأت دانشوری کی نشان دہ ہے۔ صرف یہ التماس کرتا ہوں کہ خود بزرگوں کی غلطیوں کی نشاندہی کرتے وقت آدابِ مراتب ملحوظ رکھیں اور بزرگ اپنی واقعی غلطیوں کو علم و بردباری

کے ساتھ قبول کرلیں۔ چھوٹوں کے جانی دشمن نہ ہوجائیں۔ غلطی کس سے نہیں ہوسکتی۔

حال میں ترتیب متن پر کافی توجہ کی جارہی ہے۔ دراصل جدید تحقیق کی بسم اللہ ہی دکنیات اور تذکروں کے خطی متن کی اشاعت سے ہوئی لیکن یہ مسلم ہے کہ ان ابتدائی کاموں میں ترتیبِ متن کے ان اصولوں کو پیش نظر نہیں رکھا گیا ہے اور وہ تقاضے پورے نہیں کیے گئے جن کا آجکل مطالبہ کیا جاسکتا ہے۔ رشید حسن خاں[1] نے مولوی عبدالحق کے مرتبہ ''تذکرہ نکات الشعرا'' کی کچھ غلطیوں کی طرف اشارہ کیا۔ مولوی صاحب نے مصحفی کے ''تذکرۂ ہندی'' کی اشاعت کے وقت ندوۃ العلما لکھنؤ کے کتب خانے کا نسخہ بھی پیش نظر رکھا تھا۔

حال ہی میں میرے رفیق کار شام لال کالڑا عابد پشاوری نے اس مخطوطے کو دیکھا تو اس میں انشاء کے احوال کا ایک ورق غلط جگہ لگا ہوا تھا جس میں انشاء اور عظیم بیگ کے معرکے کی اصل وجہ درج تھی۔ مولوی عبدالحق نے اسے نظر انداز کردیا کیونکہ وہ بیک وقت کئی متون بڑی عجلت کے ساتھ مرتب کررہے تھے۔

اور اس سے تحقیق کے اس نکتے کی طرف توجہ جاتی ہے کہ موضوع تحقیق بہت وسیع نہ ہونا چاہئے۔ اگر وہ پھیلا ہوا ہوگا تو اس کے مطالعے میں گہرائی نہ آسکے گی۔ اگر وہ محدود ہوگا تو ارتکازِ نظر کی وجہ سے کچھ اہم انکشافات ہوسکیں گے۔ کچھ مروجہ غلط فہمیوں کی اصلاح ہوسکے گی۔

راقم الحروف نے اردو داستانوں اور اردو مثنویوں پر ریسرچ کی۔ اگر یہ کام کسی ایک مصنف کی داستانوں یا مثنویوں یا کسی مخصوص داستان مثلاً قصۂ چہار درویش یا ''داستان امیر حمزہ'' سے متعلق ہوتا تو اس کی تمام جزئیات کا عمیق مطالعہ کیا جاسکتا تھا۔ اگر وسعت موضوع کے باوجود دقت نظر کو بھی شعار بنایا جائے تو پھر تیس چالیس سال کے لیے زلفِ گرہ گیر کے اسیر ہوجایئے۔ جیسے قبلہ سید مسعود حسن رضوی اردو مرثیے کی تاریخ ختم نہیں کرپارہے ہیں:

ہر چہ گیرید مختصر گیرید

ترتیبِ متن سے متعلق میں دو نکتوں پر توجہ چاہوں گا۔

1- اگر ایک متن کے متعلق کئی نسخے میسر ہوں تو مرتب کیا طریقہ اختیار کرے۔ مالک رام صاحب کا قول ہے:

> ''اگر آپ نے تمام شرطوں کا لحاظ رکھتے ہوئے اساسی نسخے کا انتخاب کرلیا تو آپ اسی کے متن کو بنیادی قرار دیں اور دوسرے تمام نسخوں کو اختلاف کے لیے استعمال کیجئے اِلّا یہ کہ بداہتاً معلوم ہوجائے کہ اساسی نسخے کا متن ناقص ہے اور کسی دوسرے نسخے کا ٹھیک ہے۔ اس صورت میں آپ دوسرے متن کو لے کر اساسی نسخے کے الفاظ حاشیے میں رکھ سکتے ہیں لیکن یہ بہت بڑی ذمہ داری ہے اور اس کا جواز ثابت کرنے کے لیے آپ کو مضبوط دلائل پیش کرنا پڑیں گے۔''[2]

ڈاکٹر نذیر احمد نے کئی سال قبل اس طریقے کی سخت نکتہ چینی کی:

> ''اس طریقۂ کار میں ایک بڑا نقص یہ ہے کہ اگر ایک نسخہ کو پورے کا پورا متن قرار دے دیا جائے اور دوسرے تمام نسخوں کے اختلافات کو حاشیے میں جگہ دی جائے تو یہ کام ایسا شخص بھی کرسکتا ہے جو زبانِ متعلقہ سے بہت ہی کم واقفیت رکھتا ہو۔ دوسرے نسخوں کے اختلافات (کو) خواہ وہ کتنے ہی وقیع کیوں نہ ہوں ثانوی حیثیت دینا ایک طرف تو مصنف کے بجائے کاتب تک پہنچنے کی کوشش ہے تو دوسری طرف خود محقق متن کا مرتبہ گھٹ کر ایک کاتب کے درجہ تک پہنچ جاتا ہے.....
>
> حاصل کلام اگر ایک نسخے کو متن قرار دیا گیا تو پھر غور وفکر کا دروازہ بند ہوجاتا ہے۔ اس بنا پر میرے نزدیک ایسا متن ناقابلِ توجہ ہے اور نہ ایسے محقق متن کی کوشش قابل ستائش[3]۔''

ڈاکٹر خلیق انجم[4] نے مخطوطوں کو مصنف کے اصلی نسخے تک واسطوں کے لحاظ سے گروہوں میں تقسیم کرنے کی سفارش کی ہے۔ ان میں سے ہر گروہ کو لے کر ایک ایک مشترک بنیادی نسخہ تیار کیا جائے اور پھر ان بنیادی نسخوں کو پیش نظر رکھ کر ان سب کا نچوڑ مرتب کیا جائے۔

اس طریق کار میں دو قباحتیں ہیں:

اول تو مختلف مخطوطوں اور مصنف کے نسخے کے درمیان کے واسطوں کا علم نہیں ہوسکتا۔

دوسرے اس بارہ طریقہ میں بہت طول امل ہے۔

میں ڈاکٹر نذیر احمد کے طریقۂ کار سے متفق ہوں۔ مرتب کو تمام نسخوں کا عطر مجموعہ لے کر ان سب سے جدا ایک اور متن تیار کرنا چاہئے۔ وہ ہر جملے اور ہر مصرع کے لیے تمام نسخوں کے اندراجات پر غور کرے اور پھر ایسا نسخہ تیار کرے جو مصنف کے نسخے کے نزدیک ترین ہو۔ اگر ایک اساسی متن ہی کو مرکزی متن کے طور پر درج کردیا گیا تو اس سے قاری کی رہبری کہاں ہوئی۔ قاری کو خود ہر جملے یا مصرع کے اختلافات نسخ کے بیچ بھٹک کر طے کرنا ہوگا کہ کسے پسند کرے۔ بہت ممکن ہے کہ کوئی مخصوص نسخہ دوسروں سے زیادہ اہم ہو اور دوسرے تمام نسخوں کے مقابلے میں اس کے مندرجات کو اکثر موقعوں پر قبول کیا جائے لیکن اسے پورے کا پورا مرکزی متن نہیں قرار دیا جاسکتا۔

متن کی اشاعت میں قدیم املا برقرار رکھا جائے یا جدید، اس بارے میں میں ذیل کے چند اصول پیش کرنا چاہتا ہوں۔

(الف) جن مقامات پر مخطوطے کا املا موجودہ تلفظ سے کوئی فرق ظاہر نہیں کرتا بلکہ محض فرسودگیٔ املا ہے، وہاں جدید املا اختیار کیا جائے مثلاً:

اوس۔ فرسنک۔ کنکا۔ خوشے۔ آتا ہی۔ ساتہی۔ کھیں۔ کو بالترتیب:

اس فرسنگ۔ گنگا۔ خوشی۔ آتا ہے۔ ساتھی۔ کہیں لکھا جائے۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو مطبوعہ نسخے کے ہر قاری کو مرتب متن کا ساعلم درکار ہوگا۔

(ب) جن مقامات پر فرسودہ املا کسی فرسودہ تلفظ کی ترجمانی کرتا ہے اور جسے بدلنے سے مصنف کا پیش کردہ تلفظ بل جائے گا وہاں مخطوطے کا اصل املا ہی برقرار رکھا جائے۔ مثلاً:

کوں۔ سوں۔ منیں۔ کبھو۔ کسو۔ جد۔ تد۔ تلپھنا۔ کو بالترتیب:

کو۔ سے۔ میں۔ کبھی۔ کسی۔ جب۔ تب۔ تڑپنا نہ لکھا جائے۔

جیسا کہ پہلے بھی کئی بار کہا گیا ہے، تحقیق کے بڑے کاموں کے لیے اجتماعی منصوبہ بند طریق کار کی ضرورت ہے۔ ترتیب متن کے علاوہ تاریخ ادب اردو، انسائیکلوپیڈیا اور مختلف قسم کے ببلیوگرافیوں کی کتنی کمی ہے، اس سلسلے میں بہت سے منصوبے پیش کیے گئے ہیں۔ لیکن ان پر عمل کون کرے! اس لیے مجھے مزید منصوبے پیش کرنے کی جرأت نہیں، جن درسگاہوں کے شعبۂ اردو توانا ہیں اور جن کے وسائل کافی ہیں، وہ شعبے نیز دوسرے ادارے اس سلسلے میں کچھ توجہ کریں۔

(آجکل جنوری 1974)

بقیہ: غیر مسلم مصنفینِ اردو کانفرنس

کلکتہ سے ڈاکٹر شانتی رنجن بھٹا چاریہ، سرینگر سے جگن ناتھ آزاد، کیتھل سے رانا گنّوری، چنڈی گڑھ سے کشمیری لال ذاکر، حیدرآباد سے طالب شاہ آبادی، الٰہ آباد سے فراق گورکھپوری، نابھہ سے آزاد گلاٹی، فرید کوٹ سے ایس کے رام پال اور اورنگ آباد سے جوگندر پال سرفہرست ہیں۔ مشاہدین میں پروفیسر آل احمد سرور، سہیل عظیم آبادی، سردار جعفری، مجروح سلطانپوری، ساحر لدھیانوی، ڈاکٹر ظ۔ انصاری، کلام حیدری، مظہر امام، ڈاکٹر محمد حسن خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ اتر پردیش کے متعدد شہروں اور قصبوں سے غیر مسلم ادیب و شاعر اس کانفرنس میں شرکت کرنے کے لیے آئے تھے۔

10 نومبر کو صبح ساڑھے دس بجے کانفرنس کی سبجکٹس کمیٹی کا اجلاس ہوا جس کی صدارت ڈاکٹر گیان چند نے فرمائی۔ اس اجلاس میں رام لال نے کانفرنس کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی اور پروگرام کی تفصیل بتائی۔

جناب ستیش بترا نے مندوبین کو خوش آمدید کہا اور فرمایا کہ ''اب اردو کے حق میں حالات سازگار ہیں اور سرکار ہمارے مطالبات کو سننے اور ان پر عمل پیرا ہونے کے لیے آمادہ نظر آرہی ہے۔ اس لیے ہمارا یہ کام ہے کہ اردو کے تحفظ کے لیے ہم اپنے مطالبات کو واضح اور غیر مبہم الفاظ میں سرکار کے سامنے رکھیں اور کوشش کریں کہ اردو کو اس کا جائز مقام حاصل ہو جائے۔''

ڈاکٹر گیان چند نے اپنی تقریر میں کہا کہ ''اردو صرف مسلمانوں ہی کی نہیں بلکہ لاکھوں غیر مسلم حضرات کی بھی زبان ہے۔ اردو کے اہل قلم حضرات غیر مسلم بھی ہیں، جن میں سے بہت سے حضرات صفِ اول میں شامل ہیں۔''

سبجکٹس کمیٹی کے اس اجلاس نے سات ریزولیوشنوں کے مسودے تیار کیے، جو مندوبین کے عام جلسے میں پیش اور پاس کیے جانے والے تھے۔

10 نومبر کو سہ پہر میں منی روندرالیہ میں ڈیلی گیٹ اجلاس اردو کے مشہور شاعر پنڈت آنند نرائن ملا کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اس ڈیلی گیٹ اجلاس نے سات ریزولیوشن پاس کیے جن میں مراعات وحقوق کی مانگ کی گئی۔ ایک ریزولیوشن میں ڈیلی گیٹ اجلاس نے حکومت سے مطالبہ کیا کہ ''جن ریاستوں کی سرکاری زبان ہندی قرار دی جا چکی ہے وہاں اردو کو ثانوی زبان قرار دیا جائے اور وہاں کے تعلیمی اداروں میں میٹرک یا ہائر سیکنڈری درجوں تک اردو کی تعلیم کو لازمی قرار دیا جائے۔'' ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے پیش کردہ اس ریزولیوشن کی تائید جدید شاعر بلراج کومل نے کی۔ اس قرارداد کی حمایت میں مشہور افسانہ نگار کشمیری لال ذاکر، مہر گیرا اور ڈاکٹر نریش نے تقریریں کیں۔

اجلاس نے مشہور غزل گو شاعر ساحر ہوشیار پوری کے پیش کیے ہوئے ایک دوسرے ریزولیوشن کے ذریعہ مرکزی اور ریاستی حکومتوں سے مطالبہ کیا کہ ''ان تمام ریاستوں میں جن کی سرکاری زبان ہندی نہیں ہے۔ ان علاقوں کی نشاندہی کی جائے جہاں اردو بولنے یا جاننے والے رہتے ہیں اور ان علاقوں میں اردو کی تعلیم کا مناسب انتظام کیا جائے۔''

ریزولیوشن کی تائید اردو کے بنگالی ادیب ڈاکٹر شانتی رنجن بھٹا چاریہ نے کی۔ سوشیل رام پال نے بھی ریزولیوشن کی حمایت میں تقریر کی۔

اجلاس نے کانفرنس کے کنوینر ڈاکٹر نریش کے پیش کیے ہوئے ایک اور ریزولیوشن کے ذریعے اس امر کی تائید وتصدیق کی کہ اردو کسی ایک فرقے یا قوم کی زبان نہیں بلکہ ملک کے تمام لوگوں کی زبان ہے۔ ریزولیوشن میں ملک کی تمام سیاسی پارٹیوں اور ان کے لیڈروں سے اپیل کی گئی کہ وہ اردو کو کسی خاص فرقہ یا مذہب سے منسلک نہ کریں اور اردو کو اس کا حق دلوانے میں مدد کریں۔ اس ریزولیوشن کی تائید مشہور اردو شاعر جگن ناتھ آزاد نے کی۔

اجلاس نے اپنے چوتھے ریزولیوشن میں جسے ڈاکٹر طالب شاہ آبادی نے پیش کیا تھا۔ مرکزی حکومت سے مطالبہ کیا کہ ان تمام ریاستوں میں جن کی سرکاری زبان ہندی ہے، سرکاری ملازمت دیتے وقت امیدواروں کے لیے میٹرک یا ہائر سیکنڈری درجات تک اردو کی تعلیم لازمی قرار دی جائے اور حکومت اس امر کو یقینی بنائے کہ اس کے احکام یا ہدایات پر ریاستی حکومتیں عمل درآمد کرتی ہیں۔

ریزولیوشن کی تائید بنگالی اردو شاعرہ کمل چٹرجی شبنم نے کی۔ جناب اجمیر سنگھ سینی اور کشمیری لال ذاکر نے بھی حمایت میں تقریریں کیں۔

ممتاز اردو افسانہ نگار کرشن چندر کے پیش کیے ہوئے ایک ریزولیوشن کے ذریعہ ڈیلی گیٹ اجلاس نے مرکزی حکومت سے مطالبہ کیا کہ آل انڈیا ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے پروگراموں میں اردو کے پروگراموں کا وقت بڑھایا جائے اور مختلف ریاستوں میں ریڈیو اسٹیشنوں پر متعلقہ علاقہ کے ادباء اور شعراء کو یکساں نمائندگی دی جائے۔

ریزولیوشن کی تائید اور حمایت میں جدید اردو شعراء کرشن موہن اور جناب مظہر امام نے اظہار خیال کیا۔

ڈیلی گیٹ اجلاس نے اپنے چھٹے ریزولیوشن میں ملک کی تمام یونیورسٹیوں سے اپیل کی کہ وہ اپنے یہاں طلبا کو پرائیویٹ امیدوار کی حیثیت سے اردو کا کوئی بھی امتحان دینے کی اجازت دیں اور اس سلسلے میں ضروری سہولتیں فراہم کریں۔

جدید شاعر آزاد گلاٹی کے پیش کیے ہوئے اس ریزولیوشن کی تائید جناب سوشیل رتن چوپڑا نے کی۔

اجلاس نے جس ساتویں ریزولیوشن کو منظوری دی اس میں مرکزی حکومت سے کہا گیا ہے کہ چونکہ مرکزی نظم ونسق کے علاقہ چنڈی گڑھ کی علاقائی زبان سرکاری طور پر اردو قرار دی جا چکی ہے، اس لیے چنڈی گڑھ کے تمام اسکولوں میں بلا تاخیر اردو کی تعلیم کو لازمی قرار دے کر اردو کی تعلیم کے لیے مناسب انتظامات کیے جائیں۔ ریزولیوشن پیش کرتے ہوئے جناب گرپرشاد جنرل نے کہا کہ اردو کو علاقائی زبان کی حیثیت سے سرکاری طور پر تسلیم کر لیا گیا ہے مگر حیرت کی بات ہے کہ تعلیمی اداروں میں اردو کی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں ہے۔ تائید جناب مہر گیرا نے کی۔ ڈاکٹر نریش نے جو چنڈی گڑھ سے تعلق رکھتے ہیں کہا کہ اردو کے مطالبات کے سلسلے میں کسی دوسرے علاقے یا ریاست کے نام نہیں لیا گیا۔ چنڈی گڑھ کے سلسلے میں خاص طور پر ریزولیوشن اس خیال سے لایا جا رہا ہے کہ وہاں اردو کا ایک بھی مسلمان ادیب یا شاعر نہیں رہتا اور ہندو، سکھ، عیسائی ادیبوں، شاعروں کی کانفرنس اس مطالبے کے لیے موزوں ترین پلیٹ فارم ہے۔

شام کے اجلاس میں کانفرنس کے چیف کنوینر جناب رام لال نے کہا کہ اردو کو وہ درجہ نہیں دیا جارہا ہے، جس کی وہ مستحق ہے۔ اجلاس کے صدر پنڈت آنند نرائن ملا نے اپنی تقریر میں اس بات پر خوشی ظاہر کی کہ آج اردو کے معاملے میں ملک کی فضا پہلے سے بہتر ہے۔ ملاّ صاحب نے کہا ''ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ ہم پر جو ناجائز جبر کیا گیا ہے، اسے ہٹایا جائے اور ہم کو اپنے قدموں پر کھڑا ہونے کا موقع دیا جائے۔''

10 نومبر کی شام کو طے شدہ پروگرام کے مطابق کرسچن کالج کے ہال میں کہانیوں کی شام کا پروگرام پیش کیا گیا۔ صدارت لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے صدر ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی نے کی۔ افتتاحی تقریب بیگم حامدہ حبیب اللہ نے اور پنڈت آنند نرائن ملاّ نے پروگرام کا افتتاح فرمایا۔ اس نشست میں ستیش بترا، جوگندر پال، کرشن چندر، آنند رومانی، شرون کمار ورما، کوثر چاندن پوری، کشمیری لال ذاکر اور سہیل عظیم آبادی نے اپنی کہانیاں پڑھیں۔

غیر مسلم اردو مصنفین کانفرنس کے پہلے دن، رات میں 9 بجے ایک عظیم الشان مشاعرہ ہوا۔ اس مشاعرے کا افتتاح اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ ہیم وتی نندن بہوگنا نے کیا۔ موصوف نے اپنی تقریر میں کہا کہ اردو، تامل، تیلگو، گجراتی، مراٹھی وغیرہ کی طرح ہمارے ملک کی ایک زبان ہے جسے آئین میں تسلیم کیا گیا ہے اور جس نے ہمارے ملک کی زندگی میں آزادی سے قبل اور آزادی کے بعد ایک نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ شری بہوگنا نے ہر مسئلے کو سیاست سے جوڑ دیے جانے کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ یہ فرقہ وارانہ تصور بھی عام ہوگیا کہ ہندی ہندوؤں کی ہے اور اردو مسلمانوں کی۔ اس بات کو جب تک ذہنوں سے دور نہ کیا جائے گا، مسئلے کو حل کرنے میں دشواریاں حائل رہیں گی۔ انہوں نے مزید کہا کہ ''انقلاب کے ترانے گانے والی زبان آزادی کے بعد بے گھر ہوجائے اس سے زیادہ دکھ کی بات اور کوئی نہیں ہوسکتی۔'' اس سے پیشتر انہوں نے فرمایا کہ وہ سال ڈیڑھ سال سے اردو کی کھلم کھلا حمایت کرتے رہے ہیں اس لیے نہیں کہ ان کا مقصد کسی کو خوش کرنا ہے بلکہ اس لیے کہ اردو ادب ہمارے قیمتی، ثقافتی ورثہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ فرقہ پروری کے باعث اگر اردو بے گھر ہونے لگے تو ہر شخص کا فرض ہوجاتا ہے کہ وہ اردو کی حمایت کرے اور اسے بچائے۔

مشاعرے کے آغاز سے پہلے رام لال نے اور آل انڈیا میرا کیڈمی کے صدر مقبول احمد لاری نے مشاعرہ کی استقبالیہ کمیٹی کے صدر کی حیثیت سے اپنے خطبے میں یہ امید ظاہر کی کہ بہوگنا کے عہد حکومت میں اردو کی ترقی میں پیش آنے والی رکاوٹوں کو دور کیا جائے گا۔

مشاعرے کی صدارت شام کشن نگم نے کی۔ مشاعرے میں ساحر لدھیانوی، سردار جعفری، خمار بارہ بنکوی، جگن ناتھ آزاد، آل احمد سرور، کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، پریم لال شفا، گیان سنگھ شاطر، ساحر سنامی، ساحر ہوشیار پوری، کرشن موہن، پنڈت میلا رام وفا، ناظر خیامی، دِوا کر راہی، رانا گنوری، ثاقب بریلوی، آزاد گلاٹی، کرشن مراری اور دوسرے مشہور شعرا نے اپنا کلام سنایا۔

کانفرنس کے دوسرے دن یعنی گیارہ نومبر کو دو مذاکرے ہوئے۔ صبح کے اجلاس میں پہلا مذاکرہ ''اردو سے ہمارے رشتے'' کے عنوان پر ہوا۔ اس اجلاس کی صدارت ریٹائرڈ آئی سی ایس اور وزارتِ دفاع کے سابق سکریٹری جناب دی شنکر نے کی۔ اس اجلاس کا افتتاح کرتے ہوئے اردو کے ممتاز ناقد پروفیسر آل احمد سرور نے کہا کہ مچھلی جو دریا میں رہتی ہے، بعض اوقات محسوس نہیں کر پاتی کہ اس کا دریا سے کیا رشتہ ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہمارے اور ہماری زبان کے رشتے کی نوعیت بھی یہی ہے۔ پروفیسر موصوف نے اردو کی خدمات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ ''انقلاب زندہ باد'' سے ''غریبی ہٹاؤ'' تک ہر نعرے کے لیے اردو کا سہارا لینا پڑا ہے۔ سرور صاحب نے امید ظاہر کی کہ جو بات سورج کی طرح روشن تھی، وہ اس کانفرنس سے کچھ اور زیادہ آئینہ ہوجائے گی۔ انہوں نے کہا کہ اگرچہ فضا کچھ بدلی ہے، کچھ بادل چھٹ رہے ہیں پھر بھی ہمیں اردو کے لیے اپنی جدوجہد جاری رکھنی ہوگی۔

اس اجلاس میں جموں یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے صدر ڈاکٹر گیان چند اور دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے ریڈر ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے اپنے مقالات پیش کیے۔ بحث میں حصہ لیتے ہوئے ترقی پسند شاعر علی سردار جعفری نے کہا کہ وہ ہندی والوں کے سامنے اردو کو ایک حریف کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک ہندوستانی زبان کی حیثیت سے پیش کرنا چاہتے ہیں۔ اسے کاروبار اور نظم ونسق میں ایک مقام اور اس کی تعلیم کی سہولتیں بہرحال ملنی چاہئیں۔

مشہور شاعر عرش ملسیانی نے کہا کہ اردو سے ہمارا رشتہ بہت مضبوط اور مستحکم ہے اور ہم اردو کے لیے اس وقت تک جدوجہد جاری رکھیں گے جب تک اردو کو اس کا جائز حق نہیں مل جاتا۔ ڈاکٹر محمد حسن نے بحث کے دوران میں کہا کہ ہم اردو کے لیے مراعات نہیں، بلکہ ہندوستان کے آزاد شہری کی حیثیت سے اپنا حق چاہتے ہیں۔ بحث میں بلراج کومل، سلامت علی مہدی، دوا کر راہی اور کوثر چاندپوری نے بھی حصہ لیا۔

آخر میں اجلاس کے صدر وی شنکر نے اپنی تقریر میں کہا کہ اردو ہر اعتبار سے اس بات کی مستحق ہے کہ وہ قومی زبان بنے کیونکہ یہ کئی زبانوں سے مل کر بنی ہے اور اس کی وسعت اس سمندر جیسی ہے جس میں بہت سے دریا آکر گرتے ہیں۔ موصوف نے مزید کہا کہ اردو نے تین چار سو برسوں میں قوم کی وہ خدمت کی ہے جس کی مثال نہیں ملتی۔ قوم کے سامنے کوئی بھی ایسا نازک وقت نہیں آیا جب اردو نے بہ آواز بلند وطن کا ساتھ نہ دیا ہو۔ نیز تحریک آزادی کے دوران میں قومی ولولوں کی جتنی ترجمانی اردو نے کی ہے، اتنی کسی اور زبان نے نہیں کی۔

سہ پہر میں ''ہم اردو کے طرف دار کیوں ہیں'' کے عنوان پر مذاکرہ ہوا۔ اس کھلے اجلاس میں حضرت فراق گورکھپوری اور پنڈت آنند نرائن ملاّ نے تقریریں کیں۔ آخر میں کرشن چندر نے اپنے خطبۂ صدارت میں کہا کہ ''جو لوگ اردو زبان سے نفرت کرتے ہیں یا اس کے وجود سے انکار کرتے ہیں وہ ہماری مشترکہ تہذیب اور کلچر سے انکار کرتے ہیں۔'' انہوں نے مطالبہ کیا کہ ''پرائیویٹ سطح سے سرکاری سطح تک وہ تمام حقوق جو دوسری قومی زبانوں کو مل چکے ہیں، وہی تمام حقوق اردو کو بھی ملنا چاہئیں۔ یہی اس کانفرنس کی آواز ہے۔'' (ادارہ)

ایڈیٹر — مہدی عباس حسینی
سب ایڈیٹر — نند کشور وکرم
ماہنامہ 'آجکل' (جنوری 1974)

مراسلات

● ماہنامہ 'آجکل' نومبر 2020 کا شمارہ موصول ہوا۔اس میں اپنی ایک غزل کی شمولیت سے باعث مسرت ہوئی اس کے لیے شکریہ قبول کریں۔مگر کمپوزنگ کی غلطی سے غزل کا مطلع شائع ہونے سے رہ گیا ہے۔جو مندرجہ ذیل ہے:

عجیب شہر کا منظر دکھائی دیتا ہے
ہر ایک ہاتھ میں خنجر دکھائی دیتا ہے

زیر نظر شمارہ بلاشبہ نہایت عمدہ اور کار آمد ہے۔سبھی مقالات، افسانے اور غزلیں قابل ستائش ہیں۔اتنا اچھا شمارہ ترتیب دینے کے لیے آپ حضرات قابل صد مبارکباد ہیں۔ اللہ کرے کہ ماہنامہ 'آجکل' اسی طرح دن دونی رات چوگنی ترقی کرتا رہے آمین۔

جوہر نوری

محلّہ چودھرانہ، نزد مسجد آرہ، بھوجپور (بہار)

● ماہنامہ آجکل نومبر 2020 کا شمارہ موصول ہوا۔اداریہ میں ''کورونا بیماری سے بدلتا منظر نامہ'' عنوان کے تحت ادب کے بدلتے منظر نامے پر بات کی گئی ہے جو بہت اہم ہے۔کورونا کے اس دور نے جہاں زندگی کے دیگر شعبوں کو متاثر کیا ہے وہیں ادب میں بھی تبدیلی آئی ہے۔افسانے کے باب میں ذکیہ مشہدی کا افسانہ ''گلمت گڑیوں کا صندوقچہ'' ایک بہترین افسانہ ہے۔وہ دور حاضر کی مشہور افسانہ نگار ہیں، ان کے افسانے پر تبصرہ کرنا سورج کو چراغ دکھانے کے مانند ہے۔علاوہ ازیں تینوں افسانے بھی بہترین ہیں۔مضامین بھی عمدہ اور معلوماتی ہیں۔علی سردار جعفری پر لکھا گیا ڈاکٹر محمد جعفر احراری کا مضمون تحقیقی ہے۔مضمون نگار نے باریک بینی سے علی سردار جعفری کی حیات وخدمات سے متعارف کرایا ہے۔ پروفیسر قاضی عبید الرحمٰن نے عنوان چشتی صاحب کی تنقیدی خدمات کو خوبی کے ساتھ پیش کیا ہے۔پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی کا مضمون ''علی گڑھ کے طنز وظرافت نگار'' خود کو ایک ہی نشست میں پڑھوانے میں کامیاب رہا۔پی پی سریواستو رند جہاں ایک اچھے شاعر ہیں وہیں نثر بھی عمدہ لکھتے ہیں۔ انہوں نے بڑے سلیقہ سے ایک بھولے بسرے رومانی شاعر پریم وار برٹنی سے متعارف کرایا ہے۔مدن لعل منچندا کا مضمون بھی قابل مطالعہ ہے۔دبستان رامپور کے حوالے سے ڈاکٹر محمد زاہد الحق نے اہم معلومات فراہم کرائی ہیں۔ڈاکٹر تابش مہدی اور میکش امروہوی کی غزلیں بہت پسند آئیں۔تالیف حیدر کے ذریعہ لیا گیا اطہر فاروقی صاحب کا انٹرویو بھی دلچسپ اور معلوماتی ہے۔

ڈاکٹر نشا رزیدی

B-63/S-2، ڈی ایل ایف کالونی، صاحب آباد، غازی آباد

● 'آجکل' میں شائع شدہ پاپولر میرٹھی کی مزاحیہ نظمیں پڑھتا رہا ہوں اور ماہ ستمبر 2020 کے شمارے میں ان کا تحریر کردہ مضمون 'پروفیسر عبدالشکور' بھی پڑھ کر طبیعت خوش ہوگئی۔میں نے بھی مزاحیہ دو نظمیں لکھی ہیں جو ہندی کے رسالوں میں شائع ہوئی تھیں۔اقبال کے شکوہ اور جواب شکوہ کی طرح ہیں۔پہلی نظم ہلڑ مرادآبادی کے ہندی ماہنامہ 'حاس پریہاس' کے مئی 1974 کے شمارہ میں شائع ہوئی تھی۔رسالہ مرادآباد سے نکلتا تھا اور میں اس زمانے میں پریکٹس کرتا تھا اور ہلڑ صاحب ایک انٹر کالج میں پڑھاتے تھے۔وہ بمبئی چلے گئے اور ان کے مرادآباد چھوڑنے کے بعد رسالہ بھی بند ہوگیا۔وہ ممبئی چلے گئے اور ان کے مرادآباد چھوڑنے کے بعد رسالہ بھی بند ہوگیا۔ہلڑ صاحب بھی شاید اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔نظم کا عنوان تھا ''ایک دن میری پتنی بولی، اے جی تم بھی کوئی وکیل ہو'' پتنی کو اس کے جواب میں لکھی گئی نظم حسن پور سے ہر سال ہولی پر ایک صاحب کی کاوش سے شائع ہونے والی ہندی پتریکا 'گلدستہ' میں 1994 میں ہولی کے موقع پر شائع ہوئی تھی۔آپ کو 'حاس پریہاس' میں شائع شدہ نظم کی فوٹو کاپی اور اس کا اردو ورژن بھیج رہا ہوں۔

اصغر حمید، ایڈوکیٹ، حسن پور، ضلع امروہہ

● ماہنامہ آج کل کا کئی برسوں سے قاری رہا ہوں لیکن کبھی مراسلہ نہیں لکھا یہ میرا پہلا مراسلہ ہے۔

اکتوبر کا شمارہ زیر مطالعہ ہے ابھی نصف ہی مطالعہ کیا تھا کہ سوچا مراسلہ تحریر کردوں۔حسن ضیاء صاحب کا مضمون گلزار دہلوی پڑھ کر ان کی حر کی تصویر ہمارے سامنے آگئی۔اگر چہ ہم انہیں برسوں سے دیکھ رہے تھے لیکن ضیاء صاحب نے جس انداز میں ہماری ملاقات ان سے کرائی اس سے حقیقت میں اندازہ ہوا کہ وہ پرانی دلّی کی تہذیب کے آخری چراغ تھے۔ مدیر محترم نے جس انداز میں اپنی تحریر پیش کی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یادوں کا پٹارہ تھا اور وہ لکھتے چلے گئے لیکن یہ کیا کہ اداریہ سے خالی شمارہ ہمارے ہاتھوں پہنچا۔خیر کوئی بات نہیں کیونکہ مدیر کی تحریر عمدہ ہے۔

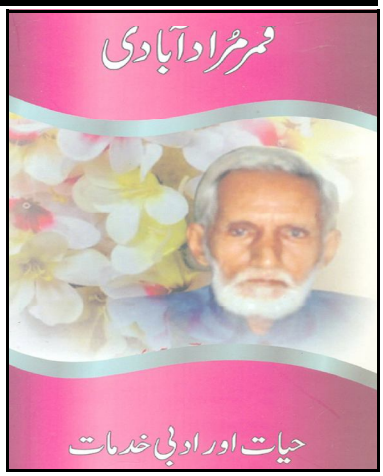
مدیر محترم نے گلزار کے جس شعر پر اپنا مضمون مکمل کیا ہے اسی کے پہلے مصرع 'مٹتی ہوئی دلی کا نشاں.....' سراج نقوی کے مضمون کا عنوان ہے۔گویا خوبصورت ترتیب ہے۔تیسرا مضمون بھی گلزار دہلوی پر ہے۔ اس میں 'گلزار غزل' کی اشاعت کو مکتبہ البوم سے لکھا گیا جبکہ وہ مکتبہ الیوم دہلی ہے۔ راحت اندوری پر مضمون دیکھ کر خوشی ہوئی۔ پروفیسر فاروق بخشی نے ذات وفن دونوں پر عمدہ روشنی ڈالی ہے۔امید ہے ان پر تحریری سلسلہ جاری رہے۔مجتبیٰ حسین پر لکھی گئی تحریر میں بھی ان کی ذات کا عکس خوبصورت انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اس میں ایک مقام پر اولول جلول لکھا گیا ہے شاید اُول جلول ہوتا ہے۔گوہر شیخ پوری کا مضمون اگر چہ مختصر ہے لیکن اس میں ذات وفن دونوں کو مضمون نگار نے پیش کر دیا ہے۔

جموں وکشمیر میں مرثیہ نگاری کی روایت ایک تحقیقی مضمون ہے اس میں مضمون نگار نے ایک بات یہ لکھی ہے کہ ''آٹھ جزوالی اس صنف کا براہ راست تعلق سانحہ کربلا سے ہے'' اور دوسری بات یہ لکھتے ہیں ''گویا جموں وکشمیر میں مرثیہ کو مرزا ہادی رسوا کی متعین کردہ ہیئت مسدس میں پہلی بار 1920 میں لکھنا شروع کیا گیا ہے''۔ان دونوں سے شاید ہی اردو کی ادبی برادری متفق ہو۔

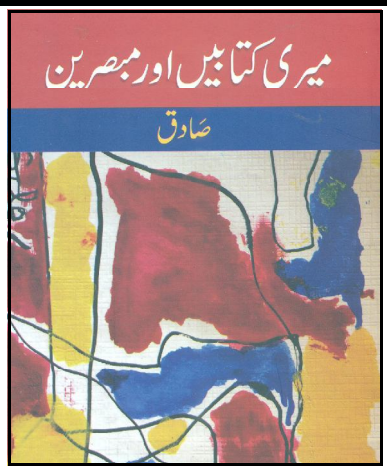
امرتسر کے نعت گو شعرا ڈاکٹر ریحان حسن کا اہم اور تحقیقی مضمون ہے۔اس میں انہوں نے امرتسر سے تعلق رکھنے والے بارہ نعت گو شعرا کو مثالوں کے ساتھ سامنے لایا ہے اتفاق سے ان میں چار ہی مسلمان ہیں اور باقی غیر مسلم۔فیض احمد فیض کو بھی انہوں نے شمار کیا ہے جنہوں نے اپنی زندگی کے پانچ سال امرتسر میں گزارے۔انہوں نے ایک مقام پر ابرار حسن گنوری نقل کیا ہے جبکہ وہ ابرا حسنی گنوری ہے۔فیض احمد فیض کی بیٹیوں کا نام انہوں نے سلیمہ اور منزہ لکھا ہے جبکہ ان کے نام سلیمہ ہاشمی اور منیزہ ہاشمی ہیں۔ بشیر صاحب کا افسانہ پڑھا واقعی میں لاک ڈاؤن پر لکھا گیا ایک عمدہ افسانہ ہے۔اس کے اخیر میں انہوں نے پھپھک لکھا ہے پ کے پیش کے ساتھ جب کہ ہندی میں پ پر فتحہ ہے اور فرہنگ آصفیہ میں پھپکنا ہے۔یہ باتیں اس لیے لکھ رہا ہوں کہ جامعات کے طلبہ ماہنامہ 'آجکل' کا حوالہ زیادہ دیتے ہیں اور سب سے معتبر بھی مانتے ہیں اور جیسا یہاں استعمال ہوتا ہے اس کو اپنی تحریر وتقریر میں ویسے ہی نقل کرتے ہیں اس لیے بنیادی اعلام واشکال پر خصوصی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

امیر حمزہ، نئی دہلی

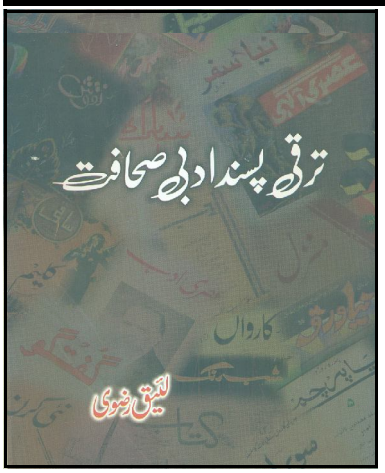
کتب موصولہ / رسائل وجرائد



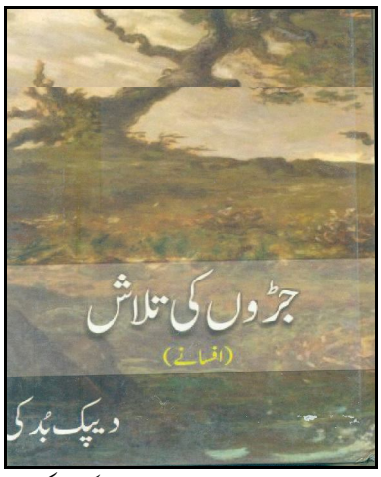
قمر مرادآبادی: حیات اور ادبی خدمات
مرتب وناشر: وہاج الحق کاشف بن قمر
سی۔61، جگر کالونی، مرادآباد، (یوپی)



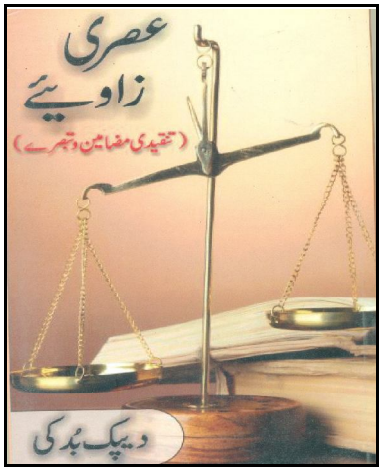
میری کتابیں اور مبصرین
مصنف: صادق
ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، D1/16، انصاری روڈ، دریا گنج نئی دہلی



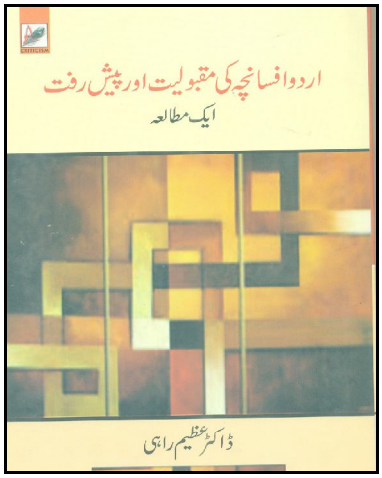
ترقی پسند ادبی صحافت
مصنف: لئیق رضوی
قلمکار، 96/B 3، اراولی، سیکٹر 34، نوئیڈا۔201301



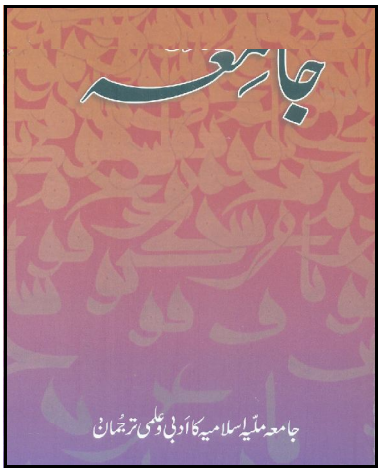
جڑوں کی تلاش مصنف: دیپک بدکی
ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس
3191، وکیل اسٹریٹ، کوچہ پنڈت، لال کنواں، دہلی



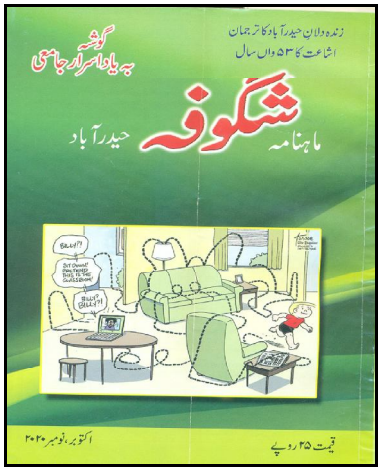
عصری زاویے (تنقیدی مضامین وتبصرے)
مصنف: دیپک بدکی ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس
3191، وکیل اسٹریٹ، کوچہ پنڈت، لال کنواں، دہلی



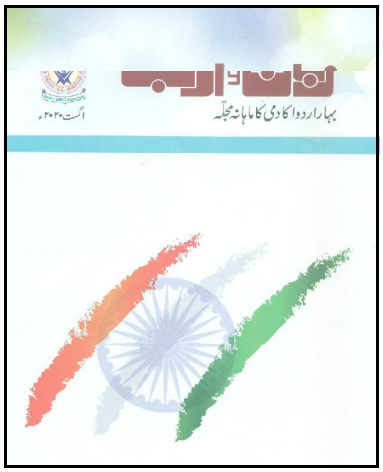
اردو افسانچہ کی مقبولی اور پیش رفت
مصنف: ڈاکٹر عظیم راہی
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، دہلی۔6



رسالہ **جامعہ**
مدیر: شہپر رسول نائب مدیر: تجمل حسین خاں
ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی



شگوفہ (ماہنامہ)
ایڈیٹر: ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال
10-4-771/A/1، او یس پورہ، ماسا ب ٹینک، حیدرآباد



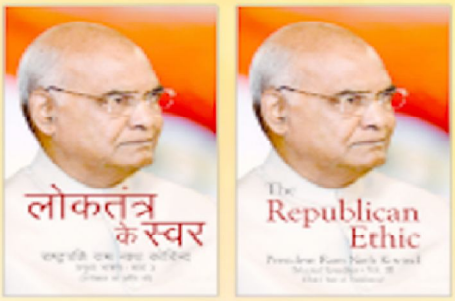
زبان وادب (ماہنامہ)
مدیر: عظیم اللہ انصاری، معاون مدیر: انوار محمد عظیم آبادی
سکریٹری بہار اردو اکادمی، اردو بھون، چوہٹہ، اشوک راج پتھ، پٹنہ۔4

Regd.No. D.L. (S)05/3198/2018-20
RNI No 948/57 (Delhi Post)
Date of Publication 12-13 December 2020
Date of Posting 15-16 December 2020

AJKAL (Urdu)
Vol.79 No.06
JANUARY 2021

Licensed U (DN) 50/2018 - 20 to post
without pre-payment at RMS Delhi
Rs. 22/- Annual Rs. 434
ISSN 0971-846X

Our New Publications









e-Version of selected books available on Amazon and Google Play

Wide range of Books on Gandhian Literature, Indian History, Personalities & Biographies, Speeches and Writings, Builders of Modern India, Art & Culture, Children's Literature

Publications Division
Ministry of Information & Broadcasting, Government of India
To buy online visit: www.bharatkosh.gov.in
For placing orders, please contact: Ph : 011-24365609, e-mail: businesswng@gmail.com
website: www.publicationsdivision.nic.in
@DPD_India

Printed and Published by **Monideepa Mukerjee,** DG, Publications Division, Soochna Bhawan, C.G.O. Complex, Lodhi Road, New Delhi-110003 Printed at M/s Multicolour Services 92 A, DSIDC Shed, Okhla Ind. Area, Phase-1. New Delhi. 110020